معرکۂ اسلام و جاہلیت

صدر الدین اصلاحی

اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور

قیمت بے جلد ۱۲/

محصول ڈاک ۳/

معرکۂ اسلام و جاہلیّۃ

یعنی

حق و باطل کی دیرینہ آویزش اور خوفناک تصادم کی

سبق آموز داستان

از

صدر الدین اصلاحی

اقبال اکیڈیمی

۵۴ - سرکلر روڈ - بیرونِ موچی دروازہ - لاہور

قیمت بجلد ۸عہ

محصول ڈاک ۳ر

فہرست مضامین

مطبوعہ اتحاد پریس لاہور

بار اوّل - - - - - - - - - - - - ایک ہزار

۱۹۴۴

بَدَا الإِسْلَامُ غَرِيبًا

وَسَيَعُودُ غَرِيبًا

جب اسلام کا دور شروع ہوا تو ابتدا ابتدا میں اس نے
اپنے آپ کو اجنبی ماحول میں پایا اور تھوڑے ہی عرصہ کے
بعد وہ پھر اسی طرح اجنبی سمجھا جانے لگے گا۔

(حدیث)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدائے عزوجل کا لاکھ لاکھ شکر جس نے اس بندۂ ہیچمدان اور ناکارۂ زین خلائق کے ذمہ یہ کلام لگایا کہ وہ اردو زبان میں دین اسلام کی تبلیغ کیلئے کچھ معلومات شائع کرے اور لکھو کھا درود و سلام محمد مصطفےٰ و احمد مجتبےٰ پر جسکے طفیل بندۂ خدا کے تعلق کا پتہ چلا۔ اور اسے اپنے مقامِ عبودیت سے آگہی ہوتی۔ اسکے بعد اللہ تعالیٰ کی ہزار ہزار رحمتیں ان صحابہ کرام علمائے عظام اور بزرگانِ بلند مقام پر ہوں جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہر طرح کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کرکے دین کی راہ کو ہم پر واضح کیا۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ وَعَلٰی جَمِیْعِ مَنْ خَدَمَ الدِّیْنَ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ ۝

اَمَّا بَعْدُ:۔

ہمارے محترم دوست مولٰنا صدرالدین صاحب اصلاحی جو مدرسۃ الاصلاح واقع سرائے میر ضلع اعظم گڑھ کے فارغ التحصیل ہونے کی رعایت سے اصلاحی کہلاتے ہیں ایک نوجوان نیک دل نیک سیرت اور پرجوش عالم دین ہیں آپنے اپنے قیام دارالاسلام واقع پٹھانکوٹ کے دوران میں محترم المقام مولٰنا سید ابوالاعلیٰ مودودی (جنکی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں) کی صحبت میں رہکر چند مضامین تحریر فرمائے تھے جن میں پہلا مضمون حقیقت نفاق تھا۔ یہ مضمون ایک مرتبہ تو رسالہ ترجمان

القرآن میں بالاقساط طبع ہؤا۔ اور پھر ایک ہی جگہ مکمل رسالہ پیغام حق میں شائع ہؤا۔ احباب کا تقاضا تھا کہ اس کو کتابی شکل دیجائے۔ چنانچہ خدا کے فضل سے وہ کتابی شکل میں حقیقت نفاق کے نام سے طبع ہؤا اور بیحد مقبول ہے۔ اب احباب کا تقاضا ہؤا کہ مولانا اصلاحی کے باقی مضامین بھی طبع ہونے چاہئیں چنانچہ دوسرا مضمون افادات حضرت شاہ ولی اللہ چھپا اور توقع سے زیادہ بنظر استحسان و قبولیت دیکھا گیا۔ اب مجھے جرأت ہوئی کہ مولانا کے باقی مضامین بھی افادہ خاص و عام کیلئے طبع کرڈالوں چنانچہ مولانا کا یہ تیسرا مضمون معرکہ اسلام و جاہلیت آپکے ہاتھ میں ہے۔ اس مضمون میں اسلام کی جو دلدوز حکایت مولانا نے بیان کی ہے کون ہے جو اس سے متاثر ہوئے بغیر رہے۔ سچ کہا ہے حضرت اقبال نے ؎

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

اب اس کے بعد مولانا کی دو کتابیں اور زیر طبع ہیں ایک "اسلام اور روحانیت" اور دوسری "افادات حافظ ابن قیم رحؒ"

مجھے امید ہے کہ مسلمان ان کتابوں سے بہت کچھ فائدہ اٹھائینگے اور اسلام کو سمجھنے اور اس پر گامزن ہونے کی بہت کچھ معلومات ان سے حاصل کرینگے ایسے حضرات سے دعا ہے کہ وہ مجھے بھی اپنی دعاؤں میں یاد کر کے عنداللہ ماجور ہوں۔ والسلام۔

(سید محمد شاہ) ایم اے۔ مہتمم اقبال اکیڈیمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بدأ الاسلام غریبا وسیعود غریبا

حق و باطل کی معرکہ آرائیاں انسانی تخلیق کے پہلے ہی دن سے عقل صحیح اور جہالت میں مسلسل ایک جنگ برپا ہے۔ عقل صحیح کا سرچشمہ انسان کی سلیم اور بے آمیز فطرت ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ نفس کے حیوانی رجحانات کا تزکیہ کرے اس کو مہذب اور شائستہ بنائے، اس کی محرک طاقتوں کو اخلاق و روحانیت کی بلندیوں تک پہنچنے میں استعمال کرے۔ اس کی لذت طلب سرشت کو علم و معرفت اور فضائل اخلاق سے لذت حاصل کرنے کا خوگر بنائے، اور اس کی طالب کمال فطرت میں حیوانات سے نہیں بلکہ فرشتوں سے بازی لیجانے کی طلب پیدا کردے۔ اس کے برعکس جہالت کا سرچشمہ نفس حیوانی ہے جو انسان کو محسوسات اور مادیات کا غلام اور خواہشات کا بندہ بنا دینا ہے۔ وہ آدمی کے ذہن سے اس شعور کو محو کردینا چاہتا ہے کہ وہ انسان ہے، اور ہر وقت اس شعور کو تازہ کرتا رہتا ہے کہ وہ بس ایک اونچے درجے کا حیوان ہے۔ اس کی پیہم کوشش یہ ہے کہ عقل کو اپنا تابع فرمان بناکر حیوانی کمالات تک پہنچنے کے لیئے اس سے خدمت لے دنیا

کی محبت، انجام سے غفلت، لذات جسمانی میں سرمستی، ظلم و عدوان، کبر و نخوت، استکبار و افساد فی الارض وغیرہ تمام رذائل اسی سے پیدا ہوتے اور اسی کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں، یہانتک کہ جب سب سے آخری زینہ پر اس کا قدم پہنچ جاتا ہے، اس وقت یہی انسان یا تو خدا کے وجود ہی سے منکر ہو جاتا ہے یا خود خدائی کے عرش پر جا بیٹھتا اور انا ربکم الاعلیٰ کا اعلان کر دیتا ہے۔

دنیا کے کارخانے میں یہی دو طاقتیں کارفرما ہیں، عقل اور جہل۔ اور انہی کی زیادہ کھلی ہوئی تعبیر حق اور باطل ہے۔ یہ سارا ہنگامہ عالم انہیں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ زندگی کی ساری تگ و دو انہیں کے دم سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کو ایک آزمائش گاہ کہا جاتا ہے کیونکہ انسان کی کامیابی و ناکامی کا دار و مدار اسی پر ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کس کی طرف کھنچتا اور کس کے تقاضوں کو قبول کرتا ہے۔ یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد واقع ہوئی ہیں۔ دونوں میں ایک فطری بُعد ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا۔ دونوں کی ماہیتیں جدا جدا اور خواص مختلف ہیں۔ ایک کا فروغ دوسرے کی موت ہے۔ رات کی تاریک فطرت کسی ذرہ پر آفتاب کا تسلط پسند نہیں کرتی۔ اور نہ آفتاب کی تیز نگاہیں کسی جگہ تاریکی کا کوئی نشان دیکھ سکتی ہیں۔ یہی

حال عالم باطن کے نور وظلمت کا ہے۔ بلکہ حق و باطل کی معرکہ آرائیاں کچھ اس سے بھی زیادہ سخت اور بے لاگ ہوتی ہیں یہاں مصالحت کا کوئی امکان نہیں جس طرح باطل کی ہر ادا حق کے لئے گھناؤنی، اجنبی اور ناقابل برداشت ہوتی ہے، اسی طرح سچائی کی ہر صدا باطل کے لئے غیر مانوس اور بیگانہ ہوتی ہے۔ دونوں مختلف جہتوں سے سرشت انسانی پر حملے کرتے ہیں۔ اسی کشمکش میں انسان کی آزمائش ہوتی ہے۔ اور انہیں کی ہار جیت پر بنی آدم کی سعادت وشقاوت کا انحصار ہے۔

اسلام کیا ہے

عقل اور جہل، حق اور باطل، نور اور ظلمت کی اس کشمکش میں دو طاقتیں دو مختلف سمتوں سے اپنے اپنے نمائندوں کی مدد کیلئے آتی ہیں۔ ایک شیطانی و طاغوتی طاقت ہے جو اس لئے آتی ہے کہ جہل اور باطل اور ظلمت کی مدد کرے اور انسان پر اس کو مسلط کر دے۔ اور دوسری ہدایات ربانی کی طاقت ہے جو انسانی پیکر میں نمودار ہوتی ہے، تاکہ عقل اور حق اور نور کے پوشیدہ خزانوں کو انسانی فطرت کی تہوں سے نکالے اور ان سے جہل اور باطل کی تاریکیوں کو دور کر دے۔ وہ بھٹکنے والے کا ہاتھ پکڑتی ہے اسے دلاسا دیتی ہے، اس کے ہاتھوں میں ایک روشنی دیکر صداقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اور جہل ونفس کی کثافتوں سے اس کے دل ودماغ کو پاک کرکے صحیح فہم وبصیرت کا آئینہ بنا دیتی ہے۔ یہ پروردگار

کی سب سے بڑی نوازش ہے جسے قرآن حکیم نے رحمت و نعمت کہا ہے لیکن جسے اسرائیلی نادانوں نے لعنت کہکر پکارا اور آج کی "مہذب و حکیم" دنیا اس سے بھی زیادہ گھنے کو تیار ہے۔ اسی روشنی کا نام اسلام یا دین الٰہی ہے۔

حق سے منہ موڑنے کا نتیجہ | حق و باطل کے مزاجی تباین کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جہاں انسان نے حق سے باطل کی طرف منہ موڑا، فوراً ہی اس کے دل و دماغ پر جہالت اور خود فراموشی کے پردے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں، اور اس سمت میں جتنا جتنا وہ بڑھتا جاتا ہے، اسی رفتار سے وہ صداقت سے بیگانہ، فطرت کے صحیح وجدان سے محروم، حقائق کے ادراک سے عاجز، اور انسانیت کے اعلیٰ و ارفع مقتضیات سے دور ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ اس کے زنگ آلود آئینہ میں سچائی اپنا کوئی عکس نہیں ڈال سکتی۔ اس کی فکر، آب و گل کے حصار میں اس طرح گھر جاتی ہے کہ اس کے ماوراء کسی شے کے وجود کا تصور ہی نہیں کر سکتی۔ اس وقت اس کے سامنے اگر علم و حکمت کے فطری نظریات پیش کئے جائیں، رموز حیات کی شرح بیان کی جائے، اور فلاح و کامرانی کے اصول سکھانے کی کوشش کی جائے تو وہ متحیر ہو کر رہ جائے گا۔ اس کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ اس کے کان کیا سن رہے ہیں۔ وہ اپنی عقل کو ان تصورات سے اس قدر بیگانہ اور نامانوس پائیگا کہ سنتے ہی کانوں پر ہاتھ رکھیگا اور چیخنا شروع کر دیگا کہ میرے پاس ایسی باتوں پر غور کرنے کیلئے کوئی وقت نہیں ہے۔ اس کے نزدیک گویا

یہ بدیہی مسئلہ ہوگا کہ اس قسم کی باتیں کرنے والا اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے سٹری اور دیوانہ ہے یا آسیب زدہ، اور اگر کچھ نہیں تو کم از کم جھوٹا اور مفتری ضرور ہے، شاعرانہ خیالات گھڑ رہا ہے، دامِ تزویر پھیلا کر دنیا کا شکار کرنا چاہتا ہے۔

کشمکش حق و باطل کی بعض مثالیں

تاریخ ہدایت اٹھا کر دیکھو ورق ورق پر یہی داستان لکھی ملیگی اور بالکل ایک ہی سے لفظوں میں۔ کیونکہ باطل کا مزاج ہمیشہ یکساں رہا ہے، اور حق کی فطرت بھی ہمیشہ غیر متبدل رہی ہے اس لئے جب جب دونوں میں تصادم ہوا، تصادم کی نوعیت بھی سدا ایک ہی رہی۔

حضرت نوح علیہ السلام نے جب جہالت کے زنگ کو کھرچنے کی کوشش کی تو باطل پرست انسان بیتاب ہوگیا اور آپے سے باہر ہوکر پتھر مارنے لگا۔ اسکی سمجھ میں بھی یہ بات، نہ آتی تھی کہ اتنی بڑی دنیا کا صرف ایک خدا کیسے ہو سکتا ہے اور کائنات کی عظیم الشان طاقتیں خدائی سے محروم ہو کر انسان کی معبود بننے کے بجائے اسکی خادم کیسے قرار پا سکتی ہیں۔ پھر وہ حیران ہو کر کہتا تھا کہ اگر بالفرض خدا ایک ہی ہے، تب بھی ایک انسان کا رسولِ خدا بن جانا کتنی انہونی چیز اور مضحکہ خیز بات ہے اور انسان بھی وہ جس کے پاس چند قلاشوں اور فقیروں کی ایک ناکارہ جماعت کے سوا کوئی طاقت نہیں۔ کس طرح مان لیا جائے کہ ایسا شخص رب السموٰت والارض کا فرستادہ اور اس کا سفیر ہو اور اس کے پاس اوپر سے ہدایت

آئے فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا
مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ
(ہود-۳) ان کا یہ تعجب اس وقت تک دور نہ ہوا جب تک عذاب الٰہی
ان پر برس نہ پڑا اور بعض تو اتنی سرمستی میں تھے کہ یہ شور قیامت بھی انکی
آنکھیں نہ کھول سکا۔ اب بھی وہ اللہ کو پہاڑ سے کمتر ہی سمجھتے رہے

قوم نوح کے بعد قوم عاد مقام جہل و ضلالت کی وارث ہوئی اور
حضرت نوح کے بعد حضرت ہود مقام علم و ہدایت کے جانشین بنکر آئے
دونوں طرف پھر وہی نقشہ تھا۔ ادھر سے عقل اور علم کی جو بات بھی کہی جاتی
تھی، اُدھر سے اس کا یہی جواب ملتا تھا کہ یہ تو ان ہونی بات ہے۔ یہ تو کبھی
سننے میں نہیں آئی۔ یہ تو کسی طرح سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ ساری کائنات
کا ایک خدا! پھر اتنے بڑے خدا سے انسان کا تعلق! پرانے زمانے کے بڑے
بڑے آدمی جاہل اور ہمارے زمانے کا ایک معمولی آدمی علم کی روشنی سے منور!
جس شخص کو ہم عام آدمیوں کی طرح کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے دیکھتے
ہیں، وہ کہتا ہے کہ میرے پاس رب السمٰوت والارض کی طرف سے وحی آتی
ہے! اور کہتا ہے کہ انسان سب سے حتیٰ کہ سورج اور چاند سے بھی بالاتر اور
صرف اللہ سے فروتر ہے! اور کہتا ہے کہ اللہ تک پہنچنے کے لئے کسی
سفارشی کی بھی ضرورت نہیں! ان میں سے ایک ایک بات جاہلوں کیلئے نرالی

تھی۔ ان کے ذہن ہر بات سے بغاوت کرتے تھے۔ آخر کار انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ ایسا شخص ضرور دیوانہ ہے اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا

حضرت لوط علیہ السلام نے تمدن و معاشرت کی بے اعتدالیوں کی اصلاح کرنی چاہی تو پوری قوم کی قوم اس نئی بات کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاہلوں کی عقل یہ بات سمجھنے سے انکار کرتی تھی کہ جو خواہش عورتوں سے پوری کی جاتی ہے، اسے اگر لڑکوں سے بھی پورا کیا جا سکے تو اس سے احتراز کیوں کیا جائے۔

مدین کی سرزمین میں بھی عقل و جہل کا نقشۂ جنگ یہی تھا۔ باطل کی محبت اہل مدین کے خون میں بُری طرح پیوست ہو چکی تھی۔ ان کے فساد مزاجی کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت شعیبؑ نے آ کر انہیں زندگی کا تریاق پلانا چاہا تو اس کی "تلخی اور سمیت" کی شکایت کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا۔ خدا کو ایک سمجھو، ان بے جان مورتیوں کے سامنے اپنے ماتھے نہ ٹیکو، خدا کی زمین میں فساد برپا نہ کرو، اپنے تمدنی و معاشی نظام کو معائب سے پاک کرو، ناپ تول میں چھل فریب سے کام نہ لو۔ قوم نے جواب دیا یہ نادر فلسفہ کس سے سیکھا ہے؟ کیا ہم اپنے خاندانی اعتقادات اور اپنے تمدن کے پرانے رسم و رواج کو تمہاری نماز پر نثار کر دیں؟ ترازو کی ڈنڈی مار کر جو فائدہ حاصل ہوتا ہے اسے محض اسلئے چھوڑ دیں کہ آخرت میں اس سے نقصان

ہوگا؟ آخرت کیلئے دنیا کو قربان کرنا اور نسیہ پر نقد کو چھوڑ دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ بڑے "حلیم" اور رشید بنکر نکلے ہو! ۔ تمہاری نماز اگر توحید و اخلاص اور صفائی معاملات کا حکم دیتی ہے تو تم اس پر عمل کرو ہمیں کیوں مجبور کرتے ہو کہ اپنا طریقہ چھوڑ دیں۔ مذہب کا معاملہ ذاتی اور انفرادی ہے۔ ساری قوم پر اپنے مزعومات کو مسلط کرنے کا تمہیں کیا حق ہے؟ قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَوٰتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ (ہود - ۸)

پیغمبر نے ان کے اس جاہلانہ تصور کو پھر دور کرنے کی کوشش کی استغفار کی طرف بلایا۔ انجام سے ڈرایا، سنت الٰہیہ کے اٹل اور سچے اصول پڑھکر سنائے جواب میں انہوں نے بھی اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔

قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ (ہود - ۸)

انہوں نے کہا اے شعیب تمہاری اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں ہم تو تم کو اپنے اندر بہت کمزور خیال کرتے ہیں اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے۔

کتنی بے باکی اور صاف گوئی سے کہہ رہے ہیں کہ ہم تو تمہاری بات سمجھتے ہی نہیں۔

پھر حضرت موسٰی علیہ السلام کی تعلیمات کے ساتھ تو قدم قدم پر اس جہالت

اور کج فہمی نے ٹکر لی۔ فرعونی گروہ نے توحید و معاد کا "نو ایجاد" نام سنا تو کہنے لگا۔

مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى	یہ تو محض گھڑا ہوا جادو (ساحرانہ ڈھکوسلا)
وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا	ہے، ہم نے تو اپنے بزرگوں میں ایسی بات
الْاَوَّلِيْنَ (قصص ۴)	کبھی سنی ہی نہیں۔

لیکن یہ تو تھے ہی پروردۂ جہل و ظلمت، تفرعن اور حبِّ نفس کے غلیظ پردے تو ان کے تخیلات پر پوری طرح چھا ہی چکے تھے۔ پر جن کے قلوب رحمت کے چشموں سے بار بار دھوئے جا چکے تھے۔ اور جنکی فطرت کو جگانے اور عقل کو جلا دینے کے لئے صیقل گرِ ازل نے پے بہ پے مواقع بہم پہنچائے تھے، ان سے بھی جب ایک اکیلے اَن دیکھے اور غیر جسمانی معبود کی پرستش کے لئے کہا گیا تو ان کا قصور اس غیر مانوس حقیقت کو اپنی گرفت میں نہ لے سکا، صبر نہ کر سکے اور بغیر سوچے کھل کر کہہ ہی دیا کہ:

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى	ہم تمہاری بات ہرگز نہ مانینگے۔ تا آنکہ اللہ کو
اللّٰهَ جَهْرَةً۔	علی الاعلان دیکھ لیں۔

آگے چل کر ایک موقعہ پر تو اس جہل پرست ذہنیت نے کمال ہی کر دیا۔ فرعون اور اس کے طاغوتی لشکر کو دریا کی موجیں نگل چکی ہیں۔ قوم یہود آسمانی رحمتوں کے سایہ میں ارض مبارکہ کی طرف ہجرت کر رہی ہے

راہ میں ایک قوم نظر آتی ہے جو تراشے ہوئے مجسموں کو سجدے کر رہی ہے۔ اس جانی پہچانی عبادت کا پرانا نقشِ محبت یکایک ابھر آتا ہے اور وہ حضرت موسیٰ سے کہتے ہیں :۔

يَا مُوسَى اجْعَل لَّنَا إِلٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ۔
اے موسیٰ جیسے ان کے خدا ہیں ویسا ہی ایک خدا ہمارے لئے بھی بنا دے۔

حضرت موسیٰ نے جواب دیا۔

إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ
تم تو نرے جاہل لوگ ہو۔

"جاہل" قوم ہو یعنی تمہارے دل و دماغ پر جذباتِ نفس اور بے عقلی کی کار فرمائی ہے جو خالص ... خطری نظریات سے مانوس نہیں ہونے دیتی

ہمیشہ انسان کی پست ذہنیت اس کو باطل پرستی پر مجبور کر دیتی ہے

یہ عہدِ عتیق کی چند سچی شہادتیں ہیں۔ ان اجمالی اشارات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علم و معرفت تہذیب و تمدن، معاشرت و سیاست، اخلاق و اعتقاد کے بلند اصول جو انسانی عقل اور روح کی مرغوب ترین غذا ہیں، خود انسان ہی کا ذوق کسی وقت میں ـــ انہیں کتنی ترشروئی اور ناگواری کے ساتھ اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ اس کی وجہ، ہر زمانہ میں، ہر جگہ اور ہر قوم کے لئے ہمیشہ ایک ہی رہی ہے یعنی انسانی ذہنیت کا پست اور اس کی فکری و عقلی صلاحیتوں کا مجروح و فاسد ہو جانا۔ یہی ایک مستقل حجاب ہے جو

حق و باطل کے درمیان ہمیشہ حائل ہوتا رہا ہے۔

شاید یہ شبہ ہو کہ یہ اس دور کے حالات ہیں جب عقلِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت سے گذر رہی تھی۔ وہ اتنی اونچائی تک پہنچنے سے خلقاً عاجز و بے بس تھی۔ لیکن نہیں، بات یہ نہیں ہے۔ اس "عہدِ طفلی" میں بھی جن کی فطرتیں پاک اور بے آمیز تھیں، مقامِ انسانیت کی قدر شناس تھیں انکے سامنے جب حق نمودار ہوا تو پکار اٹھے وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ہ حق سے دہشت کھائی، اس پر استعجاب ظاہر کیا تو اُن کور دماغوں نے جو دنیا پر مفتون تھے، محسوسات و مادیات کے غلام تھے، اپنی اہوا و آرا کو اپنا معبود بنا چکے تھے، جو انسانیت اور نفسانیت کو مترادف سمجھنے لگے تھے، جن کی عقلیں تاریک اور فطرتیں مسخ ہو چکی تھیں۔

چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ جب شعورِ انسانی اپنے کامل نشو و نما کو پہنچ چکا عقلیں پختہ اور نظریں وسیع ہو چکیں، امانتِ الٰہی کو پوری ذمہ داری کے ساتھ اٹھانیکا وقت آیا، اس وقت بھی یہ سنت بالکل اسی لباس میں نمودار ہو کر رہی، اور پیغمبرِ آخرالزماں کی بلند تعلیمات کو اسی حیرت اور استعجاب کے ساتھ سنا گیا۔ آپ کی صدائے حق کانوں کو اسی طرح اجنبی، غیر مانوس اور ناقابلِ فہم معلوم ہوئی اور آپ کو اسی طرح شاعر، مجنون،

کاہن مفتری اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا۔ اور جب قوم نے رحمت و خیر خواہی کا جواب پتھروں اور ننگی تلواروں سے دیا تو پیغمبر کی زبان سے بھی صرف یہی نکلا کہ رَبِّ اِھْدِ قَوْمِی فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ یعنی خدایا! یہ قوم مجھے ابھی سمجھ نہیں رہی ہے تو ان سے درگذر کر اور ان پر راہ حقیقت باز کر دے۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ نہ صرف سچائی مظلوم تھی اور حق فراموش ہو چکا تھا بلکہ نفس اور جہل کی فریب کاریوں نے صداقت اور ہدایت کا معیار بھی بدل ڈالا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ "دولت" اور "ہدایت" دو توام حقیقتیں ہیں۔ جو جتنا بڑا صاحب مال و اقتدار ہے اتنا ہی بڑا راستی کا حق شناس اور رحمت الٰہی کا مستحق ہے۔ کس مپرسی اور ناداری کا مفہوم سوا اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ جس کے حصہ میں آئے وہ اللہ کی رحمت و نوازش کا سرے سے استحقاق ہی نہیں رکھتا۔ اس نظریہ کی بنا پر وہ کہتے تھے کہ ایسا شخص اللہ کی ہدایت کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے۔ جو یتیم مفلس اور بے یار و مددگار ہو۔ گویا اس وقت بھی دنیوی وجاہت اور تمکن فی الارض کو اللہ کی محبوبیت اور راستی و ہدایت کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔

یہی وہ جاہلانہ تصور تھا جو قرآنی آیات و بیّنات پر غور کرنے سے انہیں بے نیاز کئے ہوئے تھا۔ اور وہ بجائے اس کے کہ صداقت کو صداقت

کی حیثیت سے جانچتے! اور اسے اخلاق و حسن فطرت کی تجلی گاہوں میں ڈھونڈھنے کے بجائے سیم و زر کے ڈھیروں میں تلاش کرنے لگے۔ وہ رسول کے دعوائے رسالت کو اس بنا پر محل تعجب سمجھتے کہ بفرض محال اگر خدا کسی فرشتہ کے بجائے ایک بشر ہی کو رسول بنا کر بھیجنے والا ہوتا، تو چاہیے تھا کہ وہ زر و جواہر سے لدا ہوتا اور عیش و تنعم کے پُر بہار باغات ساتھ لے کر آتا۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا کا فرستادہ اس کا پیغمبر برگزیدہ اور چہیتا، اس خستگی اور بے سر و سامانی کی حالت میں ہو غلاموں اور معمولی انسانوں کی طرح بازاروں میں پھرتا ہو! سارے عالم کی رحمت ہونے کا دعویٰ اور خود اپنی یہ کیفیت! اگر انسان ہی کو رسول بننا تھا تو مکہ یا طائف کا کوئی بڑا سردار بنتا۔ فاقے کرنے اور پیوند لگانے والا کیسے رسول بن سکتا ہے۔ چنانچہ جب وہ آپ کو دیکھتے تو طنز کے انداز میں کہتے۔

اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْکُرُ اٰلِهَتَکُمْ — کیا یہی وہ (بزرگ) ہیں جو تمہارے معبودوں کی تحقیر کرتے ہیں۔

پھر جب وہ پیغمبر سے نظر ہٹا کر اس کے متبعین کو دیکھتے تو تعجب، تحیر سے بدل جاتا اور ان کی بے نوائی سے پوچھتے۔

اَهٰؤُلَاۤءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنْۢ بَیْنِنَا۔ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ — کیا یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہماری قوم میں سے چن کر اپنی نوازشوں کیلئے مخصوص

بِالسِّنِيْنَ ۞ فرمایا ہے؟ کیا اللہ اپنے شکر گذار بندوں کے حال سے بھی واقف نہیں -؟

یہ انکار و تعجب تو مورد ہدایت پر تھا۔ مگر خود ہدایت اور اس کے اصول اور اسکی تعلیمات پر وہ اس سے بھی زیادہ اجنبیت اور حیرت کا اظہار کرتے -

دعوت توحید اور کور فہم انسان کا انکار -

دین فطرت کے داعی نے جب انہیں خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش سے منع کیا، بتوں کو بیجان و بے اختیار ٹھیرایا اور توحید کی دعوت دی تو قوم نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں کہ تم ایسی نرالی بات کہتے ہو جسے دنیا نے اپنی اتنی لمبی عمر کے باوجود اب تک نہ سنا تھا۔

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ..... مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هَٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ

کیا اس شخص نے تمام خداؤں کو ایک خدا بنا دیا؟ یہ عجیب بات ہے! ہم نے تو ایسی بات پہلے لوگوں سے کبھی نہیں سنی۔ یہ محض ایک گھڑی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلعم نے جب انہیں تخلیق کائنات کی حکمت بتانی چاہی جزا و سزا کا ناگزیر قانون ـــــ جس کے اعتقاد پر ساری نیکیوں کا انحصار ہے ـــ پڑھکر سنایا، بعث بعد الموت کا فلسفہ بیان کیا، تو جواب ملا، تمہاری

مجنونیت کی حد ہو گئی ہے جس جسم کے ذرے ہوا کی لا محدود وسعتوں میں منتشر ہو جاتے ہیں، زمین کے تاریک گوشوں میں دب کر رہ جاتے ہیں ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو چکی ہوں، اس کا از سر نو جسم و جان کے ساتھ اٹھ کھڑا ہونا کتنی عجیب بات ہے: ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً؟

پھر جب وہ دیکھتے کہ انہی جیسا ایک انسان اپنے آپ کو اللہ کا فرستادہ کہتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ رب السموٰت والارض کے پاس سے اس کو ہدایت مل رہی ہے تو ان کا دماغ فرط تعجب سے ماؤف ہو جاتا۔ وہ حیران ہو کر کہتے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ ایک شخص کہتا ہے کہ میں خدا کے پاس سے پیغام لایا ہوں، اور پیغام یہ سناتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ

(ق - ۱)

انہیں تعجب ہوا کہ انہیں میں سے ایک ڈرانے والا (اللہ کا فرستادہ) آیا ہے۔ پھر کافروں نے کہا کہ اس کا دعویٰ تو اور بھی عجیب ہے۔ کیا مر کر خاک ہو جانے کے بعد ہم پھر زندہ ہو کر اٹھیں گے؟ یہ واپسی تو بالکل بعید از عقل ہے۔

پیغمبر نے ان تینوں اصولی تعلیمات توحید، معاد اور نبوت پر خدا کی ارضی و سماوی بے شمار نشانیوں سے استدلال کیا۔ عام قوانین فطرت سے ان کے استعجاب کو دور کرنا چاہا۔ صحیفۂ کائنات کی نمایاں حکمتوں کو پڑھ کر سنایا۔ انہیں بار بار غور و فکر کی دعوت دی، اور آخر میں کہا بتلاؤ تم خدا کے کن کن کرشموں کا انکار کروگے اور فطرت آفاق و انفس کے کن کن دلائل و آثار سے آنکھیں بند کروگے؟ لیکن ان تغافل کیشوں نے سب کا ایک ہی جواب دیا۔

وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ۔ (حم سجدہ - ۱)

اور ان کافروں نے کہا کہ جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو اس کے لئے تو ہمارے دل پردے میں ہیں، ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے تمہارے مابین ایک حجاب پڑا ہوا ہے۔

اور ان کا یہ جواب کچھ غلط بھی نہ تھا۔ قرآن نے بھی اس کی تصدیق کی۔ مگر فرق یہ ہے کہ وہ طعن و تمسخر کے پردے میں کہہ رہے تھے، قرآن نے اس پردہ کو اٹھا کر حقیقت حال کی عریاں تصویر پیش کر دی:۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا

وہ دل رکھتے ہیں مگر اس سے سوچتے نہیں وہ آنکھیں بھی رکھتے ہیں لیکن ان

وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (اعراف - ۲۲)

سے دیکھتے نہیں ان کے پاس کان بھی ہیں پر وہ اُن سے سنتے نہیں - یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بدعقل اور گمراہ -

آخر یہ دل رکھتے ہوئے نہ سوچنے، کان رکھتے ہوئے نہ سننے اور آنکھیں رکھتے ہوئے نہ دیکھنے کا مطلب کیا ہے؟ یہ محض زجر و توبیخ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت کا بے کم و کاست اظہار ہے۔ دراصل اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیمات اور کفار کے مذاق میں بعد المشرقین ہے۔ قرآن میں مظنونات اور قیاسات نہیں ہیں بلکہ خالص علم ہے۔ وہ حقائق اشیاء کو، جیسی کہ وہ ہیں، ہو بہو دیکھتا ہے اور آثار فطرت کی شہادت سے انسان کو ان تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ خواہشات کے بجائے عقل اور نفس حیوانی کے بجائے فطرت انسانی کو براہ راست خطاب کرتا ہے۔ اس نے اخلاق اور معاملات کے جس قدر اصول و قوانین بیان کئے ہیں ان میں بھی خالص عقلیت اور بے آمیز فطریت ہے۔ اس کو سمجھنے اور اس کی پوری پوری قدر کرنے کیلئے ایسی عقل کی ضرورت ہے جو خواہشاتِ نفس کی بندگی اور روایت پرستی سے آزاد ہو کر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ ایسی بے رنگ نگاہ کی ضرورت ہے، جس پر ظنوں اور قیاسات اور رجحانات نفس کی رنگین عینکیں چڑھی ہوئی نہ ہوں۔

ایسی صحیح فطرت کی ضرورت ہے جس کو نفس حیوانی کی دست بُرد نے یا آباؤ اجداد کی اندھی تقلید نے، یا ماحول کے بُرے اثرات نے، یا قیاسی علوم کی خامیوں نے اتنا مجروح نہ کر دیا ہو کہ وہ ان بندشوں سے آزاد ہو کر کسی سچی اور حقیقی بات کو قبول ہی نہ کر سکتی ہو۔ جاہلیت کی آغوش میں جو لوگ صدیوں سے پرورش پا رہے ہوں وہ ان صفات سے عاری ہوتے ہیں۔ رسوم اور خواہشات کی غلامی سے نہ ان کی عقل آزاد، نہ نظر آزاد نہ فطرت آزاد۔ وہ صرف ایسی تعلیم مانگتے ہیں جو ان کے ظنون و اوہام ان کی خواہشات نفس کے مطابق ہو۔ مگر قرآن ان کے سامنے خالص عقل اور خالص علم اور خالص فطرت کی باتیں پیش کرتا ہے۔ اس لئے اس کی ہر ہر بات کو سن کر وہ کان کھڑے کرتے ہیں۔ ہر چیز کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو نرالی چیز ہے۔ ہماری تو سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ ہمارے لئے تو یہ بالکل اجنبی اور نامانوس چیز ہے۔

اسی لئے قرآن مجید بار بار کہتا ہے کہ جہالت اور ہوا پرستی (جسے وہ اپنی زبان میں فسق اور ظلم سے تعبیر کرتا ہے) کا غلاف جس آنکھ پر پڑا ہو وہ میری ہدایت کی روشنی نہیں دیکھ سکتا۔ اور نہ اس سے بہرہ ور ہو سکتا ہے، وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (الصّٰفّٰت ۱۰) یہ روشنی صرف اس کو مل سکتی ہے جو فطرت سلیمہ کی خالص

بصیرت سے پوری توجہ وانابت اور حضوری قلب کے ساتھ اسے ڈھونڈتے ہیں۔
اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ (قٓ - ۳) ایک جگہ پوری طرح حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ صرف عقل رکھنے والے ہی نصیحت پذیر ہو سکتے ہیں۔ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (رعد - ۳)

ہدایت کا یہی فلسفہ آیت ذیل میں بیان ہوا ہے:۔

یُضِلُّ بِهٖ کَثِیْرًا وَّ یَهْدِیْ بِهٖ کَثِیْرًا وَمَا یُضِلُّ بِهٖ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ (بقرہ - ۳)	اسی قرآن کے ذریعے خدا بہتوں کو گمراہ کرتا اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور اس سے گمراہ صرف انہی لوگوں کو کرتا ہے جو فاسق ہیں۔

اور ہدایت کے لئے ضرورت کس چیز کی ہے؟ محض عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کی اور محض صداقت کی حقیقی طلب کی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے دلائل کی تفصیل کرنے کے بعد فرماتا ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی (طٰہٰ - ۷)	ان کے اندر عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

اور

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ	یہ ایسی کتاب ہے جس میں شک کی ...

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ   بات نہیں ہے۔ یہ ہدایت ہے متقیوں کیلئے

"هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کے دو لفظوں میں اسرار ہدایت کی پوری داستان سمیٹ دی گئی ہے۔ جس کے اندر حقائق کا ایک پورا خزانہ پوشیدہ ہے۔ تقویٰ کہتے ہیں رُوح انسانی کی حمایت اور نفس حیوانی و جذبات پرستی کی مخالفت کو، اور اسلام کا دنیا سے اس کے سوا کوئی مطالبہ نہیں کہ وہ اپنی عقل اور اپنی انسانی فطرت کو ہوٰی سے پاک کرے اور اس کو قبول صداقت کے لیے صالح بنائے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس)

اور قسم ہے نفس کی اور اسکی جس نے اس کا توازن درست کر کے بدکاری اور تقویٰ دونوں کی سمجھ اسے دیدی کہ کامیاب ہُوا وہ جس نے نفس کو پاک کیا اور نامراد ہُوا وہ جس نے اسے خواہشات سے مغلوب کر دیا۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى

اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو ہوٰی سے روکا اس کا ٹھکانا جنت ہے (النازعات)

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ

جو سچی بات لیکر آئے اور جس نے سچی بات کو قبول کیا۔ بس وہی متقی ہیں۔

وَمَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الْکٰفِرُوْنَ | قرآن کے فہم و ادراک اور اس کی صداقت کو قبول کرنے میں انہی صفات کا فقدان مانع ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن کہتا ہے کہ جن لوگوں میں تقویٰ نہیں ہے، جن کے اندر قبولِ صداقت کا اندرونی رجحان ہی نہیں ہے ان کے لئے میں ہدایت نہیں ہوں، بلکہ ان کے لئے مزید گمراہی کا سبب بن جاتا ہوں، کیونکہ وہ شقاق کے ساتھ جتنا مجھ سے بُعد اختیار کریں گے اتنے ہی گمراہ ہوتے چلے جائیں گے۔

اسی لئے یہ کتاب بار بار انسان کی عقل اور اس کی فطری سمجھ بوجھ سے اپیل کرتی ہے۔ اور اس سے کہتی ہے کہ اپنی فکر و نظر کو جاہلیت کے پردوں سے نکال کر میری آیات پر غور کر:-

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد)	کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں۔

پھر اسی عتاب کو یوں ظاہر کیا جاتا ہے:-

وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (انعام - ۴)	دنیا کی زندگی محض کھیل کود ہے، دارِ آخرت (کی نعمتیں) تقویٰ اختیار کرنے والوں کیلئے بہتر ہیں کیا تم سوچتے نہیں۔

حتیٰ کہ جس روز اس جہالت کا سارا طلسم حیرت ٹوٹ جائے گا

اس روز بھی ان پر یہی جرم اور انہیں الفاظ کے ساتھ عائد کیا جائے گا۔

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ (یٰسین۔۴) — اور شیطان نے تم میں سے ایک بڑے گروہ کو گمراہ کر دیا، کیا تم (اس وقت دنیا میں) عقل سے کام نہیں لے رہے تھے۔

اس وقت ان کی آنکھوں سے پردے ہٹ چکے ہونگے اور انہیں خود حسرت ہوگی تو صرف یہی کہ:۔

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (الملک) — اگر ہم (دنیا میں) سنتے اور سمجھتے ہوتے تو آج دوزخیوں میں نہ ہوتے۔

خدا کی سنت عقل کو چھوڑ کر کسی اور چیز کو میدان بحث میں لاتی ہی نہیں پیغمبر جب کفار کی ناعاقبت اندیشی اور ان کے انکار و جمود پر اپنی شفقتوں کی وجہ سے ملول ہوتا ہے اور اس کی نگاہیں اوپر اٹھتی ہیں کہ کاش اللہ کوئی صورت ان کے ایمان لانے کی پیدا کر دے اور معجزات دکھا کر انہیں مطمئن کر دے، تو خدا کا وہ قانون جو صرف عقل و تذکر کو درخور اعتنا سمجھتا ہے پیغمبر کے اس ہمدردانہ جذبہ پر تنبیہہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ (الانعام۔۴) یعنی اے پیغمبر تم جاہلوں کی سی روش مت اختیار کرو۔ غور کرو پیغمبر کا جذبہ کتنا بلند، صالح اور پاکیزہ ہے، مگر کن الفاظ میں اس کو متنبہ کیا جا رہا ہے۔ اس سے کہا

جاتا ہے کہ تم عقل اور جاہلیت کی اس جنگ میں اپنی خواہش کو درمیان نہ لاؤ، کیونکہ تمہاری خواہش پاکیزہ ہی سہی مگر ہے تو جانب مخالف کی چیز!

انسانی جہالت کا نظریہ حیات

یہ ہیں قرآنی تعلیمات اور اصول ہدایت۔ اب دیکھو کہ اس کے منکرین کا حال، ان کا قائم کردہ معیار ہدایت، اور ان کا نظریہ حیات کیا تھا؟ اس کا جواب تاریخ سے پوچھو جو تمہیں بتائے گی کہ ان کے جیب و دامن میں جاہلیت کے سوا کچھ تھا ہی نہیں عقل و فطرت کے مقتضیات مجروح بلکہ مدفون ہو چکے تھے۔ انہیں اپنے مناصب سے معزول کر کے نفس حیوانی کی چاکری پر لگا دیا گیا تھا۔ نفس جذبات حیوانی کی تسکین کا جو طریقہ ایجاد کرتا عقل کے لئے ضروری تھا کہ اس کو معقولیت علم اور مذہبی تقدس کے خوشنما لباس پہنائے، اس کے لئے جواز کے دلائل فراہم کرے اور اس کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے وسائل ایجاد کرے۔ شراب خوری، قماربازی، سود، قتل اولاد، عریانی اور فحش کاری پر کہیں ادب لطیف کا اور کہیں آرٹ کا، اور کہیں مذہبی تقدس کا، اور کہیں معاشی فلاح و بہبود کا، اور کہیں اخلاقی جواز کا خوشنما غلاف چڑھایا گیا تھا۔ انسانی فطرت اتنی دب گئی تھی کہ وہ ان کے خلاف بغاوت کا خیال بھی دل میں نہ لاسکتی تھی۔ مال و زر کی کثرت خدا کے ہاں مقبول ہونے کی سند مانی جاتی تھی۔ باپ دادا کا طریقہ خدا کا تسلیم کردہ طریقہ مانا جاتا تھا

محسوسات کی پرستش کے وہ اتنے خوگر ہو چکے تھے کہ اس کے علاوہ کسی طریقۂ عبادت کا تصور بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ غرض علمی و اعتقادی اور عملی دونوں حیثیتوں سے وہ عقل کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ آزادانہ غور و فکر ان کی شریعت میں سب سے بڑا جرم تھا، دین و دنیا کے تمام معاملات کا فیصلہ کرنے والا ان کا نفس حیوانی تھا۔ بصیرت کی آنکھیں پھوٹ چکی تھیں۔ قلب کی صلاحیتیں مسخ ہو چکی تھیں۔ تدبیر کے کان بہرے ہو چکے تھے۔ اُن کی ساری جد و جہد اپنے غیر عقلی میلانات کی تکمیل میں صرف ہو رہی تھی۔ دنیا ان کی معبود بن چکی تھی، محسوسات پرستی ان کے فکری اور مذہبی کمال کی آخری معراج تھی یعنی انہیں "حیوان" بننے پر فخر تھا۔ وہ اس تاریکی میں تھے جسکو کوئی روشنی دُور نہیں کر سکتی تھی۔ ان کی اسی حالت کو قرآن کبھی اس طرح تعبیر کرتا ہے کہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے (تطفیف ۱) کبھی کہتا ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے (البقرہ۔۱)

اب دونوں چیزوں — قرآن کی دعوت اور منکرین کی ذہنی صلاحیت اور دماغی کیفیت — کو بالمقابل رکھ کر دیکھو کہ قرآنی تعلیمات سے یہ انکار، یہ تمرّد، یہ تعجب، یہ استہزاء اور استنکاف کس بنیاد پر تھا، تمہیں صاف نظر آئے گا کہ بس ایک ہی چیز تھی جو دونوں کے درمیان حائل تھی، یعنی جہالت نفس پرستی، آبا پرستی، ماضی پرستی اور محسوسات پرستی۔ ظاہر ہے۔

نقیضین کا اجتماع کس طرح ممکن ہے اس تباینی کیفیت میں جبکہ ایک کی بنیاد عقل وفطرت پر ہو اور دوسرے کی نفس حیوانی اور جہالت پر، ایک کی ابجد غور وفکر سے ہو اور دوسرے کی ابتدا ذبح فطرت اور قتل انسانیت پر، ایک کا قدم اول عرش پر پڑے اور دوسرے کا کعبۂ مقصود پیٹ یا شہوت ہو، ایسی حالت میں دونوں کا مصالحت کر لینا اور باہم گلے مل جانا اتنا ہی زیادہ نا ممکن ہے جتنا حق کا باطل یا باطل کا حق ہو جانا۔ جن کا حال یہ ہو کہ وہ اُوپر سے انسان اور اندر سے بہائم ہوں بلکہ جہالت اور ہوس رانی کی دوڑ میں بہائم سے بھی آگے نکل گئے ہوں وہ اس دعوت کو سمجھتے تو کیسے اور قبول کرتے تو کس طرح، جس کو جہل اور رسوم پرستی اور اندھی تقلید اور بندگی نفس سے ازلی بَیر ہے۔ اگر وہ حق سے نہ بدکتے، اس سے وحشت نہ کھاتے، اس سے بیگانگت اور اجنبیت نہ محسوس کرتے تو مقام تعجب تھا۔

تغییرِ حدیث | حق وباطل کی فطری آویزش کا یہی وہ فلسفہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

بَدَءَ الْاِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَءَ فَطُوبٰى لِلْغُرَبَاءِ (مسلم)	اسلام کا آغاز اس طرح ہوا کہ وہ "غریب" تھا۔ اور پھر ایک وقت آئے گا کہ وہ پہلے کی طرح ہو جائے گا پس مبارک ہو "غرباء" کیلئے

لفظ "غریب" کی تفسیر میں عجیب عجیب باتیں کہی گئی ہیں جن سے نہ تو کلام میں کوئی معنویت پیدا ہوتی ہے اور نہ ذوق ادب اسے تسلیم کر سکتا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے فطری جزر و مد کا جو فلسفہ اس حدیث میں بیان ہوا ہے اکثر لوگوں کی نگاہیں اس تک نہ پہنچ سکیں۔ اس لئے کسی نے "غریب" کی تشریح مفلس و نادار سے کی، اور کسی نے ادب و لغت کا کچھ لحاظ کیا تو اس کے معنی مسافر کے قرار دے دئے۔ حالانکہ یہ اور اس قسم کے تمام اقوال مضمون حدیث سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔ یہاں غریب کے معنی ہیں اجنبی اور غیر مانوس کے۔ مسافر کو غریب اسی بنا پر کہتے ہیں کہ وہ ایک اجنبی اور بیگانہ ماحول میں ہوتا ہے، جہاں اسکی ذات و صفات سے لوگوں کو کوئی واقفیت اور انسیت نہیں ہوتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غریب بس مسافر ہی ہو سکتا ہے۔ اصل غرابت صورت و شکل اور وضع و قطع کی نہیں ہے۔ بلکہ خیالات و نظریات، مذاق و مزاج اور عادات و خصائل کی ہے۔ ایک شخص اپنے احباب و اقارب میں ہوتے ہوئے بھی غریب سے غریب تر ہو سکتا ہے۔ اگر اس کی طبیعت ان سے نہ ملتی ہو اور اس کے افکار و تصورات ان سے بالکل نرالے اور مختلف ہوں۔

پس اسلام کے "غریب" ہونے کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کی ابتدا بھی حالت مسافرت اور خانہ بدوشی میں ہوئی تھی اور انتہا بھی ایسی ہی ہوگی اور نہ

اس فرمودۂ حکمت کا یہ مطلب ہے، کہ دولت اور اسلام باہم اضداد ہیں، پہلے بھی یہ مفلسوں کا مذہب تھا اور آخر میں بھی مفلسوں کا ہی مذہب ہوگا۔ بلکہ در اصل اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام جب آیا تو وہ اپنی خالص عقلیت اپنی بے آمیز فطریت، اپنے تصورات کی رفعت اور اپنے اصولوں کی پاکیزگی کے اعتبار سے اس دنیا کے لئے بالکل نرالا، بالکل اجنبی اور بیگانہ تھا جو نفس پرستوں اور بہیمیات کے بندوں سے بھری ہوئی تھی۔ اسی طرح پھر ایک دور ایسا آنے والا ہے جب دنیا اسی طرح جاہلیت میں مبتلا ہوگی۔ اور اسلام اس میں ویسا ہی اجنبی اور بیگانہ ہو جائے گا۔ اس کا نظام تہذیب اس کے قوانین معاشرت اس کے اصول سیاست سب کے سب دنیا کے لئے نامانوس اور ناقابل گرفت ہو جائیں گے۔ لوگوں کے تنگ دماغ میں اس وسیع اور بلند نظام زندگی کا تخیل سما ہی نہیں سکے گا۔ جسے اسلام پیش کرتا ہے سارا عالم جاہلیت کی تیرگیوں میں گھرا ہوگا۔ مگر اس چمکتی ہوئی کافوری شمع سے وحشت کھائے گا۔ جس کی شعاعیں قرآن کے سینے سے پھوٹ رہی ہونگی اس سے روشنی حاصل کرنا بے عقلی سمجھا جائے گا۔ اس سے روشنی حاصل کرنیوالوں کا مذاق اڑایا جائے گا۔ اور ان پر پھبتیاں کسی جائیں گی۔ پس جاہلیت کے اس چھا جانے والے سیلاب میں جس کا قدم جما رہا جس نے اس ناموس صدا کے درد سے اپنی زبان نہ روکی، جس نے اسلام کی اسپرٹ کو پا لیا

طرح سمجھنے سمجھانے اور اسی پر عمل کرنے میں زندگی بسر کی جس نے ہوا پرستی کے طوفانِ عام میں عقل کا سر رشتہ نہ چھوڑا یعنی جوانیوں میں رہکر بھی بیگانہ رہا وہی "غریب" ہے اور اسی کے لئے مبارکی ہے۔

سرکار رسالت آب کا یہ بیان کس قدر صحیح اور پیشینگوئی کس قدر سچی ہے۔ پُرانی جاہلیت میں بھی اسلام غریب تھا۔ اور نئی جاہلیت میں بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ پھر غریب نظر آرہا ہے۔

جب اسلام کی دعوت ابتدا میں ظاہر ہوئی تو صرف یہی نہ ہوا کہ توحید اور معاد اور رُوحی اور رسالت جیسے اعلیٰ و ارفع حقایق پر جاہلیت کے غلافوں میں لپٹی ہوئی عقلوں نے حیرت اور اچنبھے کا اظہار کیا ہو۔ بلکہ عام دنیوی معاملات میں بھی جن احکام اور جن اصولوں کی حکمتیں بالکل واضح اور مصلحتیں بالکل نمایاں تھیں دنیا والوں کی عقل نے انہیں بھی سمجھنے اور ماننے سے برملا انکار کر دیا۔ بلکہ آگے بڑھکر اگر تم خود صحابۂ کرام کے حالات پر گہری نظر ڈالوگے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ اسلامی تصورات کی پاکیزگی اور بلندی کو پوری طرح سمجھنے اور اسے اپنے اندر جذب کرنے میں ایسی بے نفس اور حق آگاہ جماعت کو بھی کیا کیا دقتیں پیش آئیں۔ گاہے بگاہے پُرانے غیر اسلامی جذبات و تخیلات کس طرح ان کے ذہن پر ابھر آتے تھے اور رسول اللہ صلعم نے کتنی جانفشانیوں کے بعد ان کے دلوں سے جاہلیت

کا رنگ بھر دینے میں کامیابی حاصل کی؟

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا مشاہدہ عقائد کے علاوہ اسلامی نظام کے ایک ایک شعبہ اور جزئیہ میں کیا جا سکتا ہے۔

اسلامیت سے اہلِ باطل کی اجنبیت

خود اسلام کی ہیئت ترکیبی کو لو۔ جب اس نے انسانی حرکات و سکنات کے ایک ایک گوشہ میں تقویٰ اور پاکیزگی کا رنگ بھرنا چاہا، لوگوں کے تمام افکار و عواطف پر بندشیں لگانی شروع کیں اور اخلاق و معاملات کے اندر باطل کے منافذ ایک ایک کرکے بند کرنے شروع کئے تو کفار و منافقین اس کلیت اور ہمہ گیری کا مذاق اڑاتے تھے مذہب کا جو جاہلی تصور ان کے دماغوں پر چھایا ہوا تھا، اور چند لایعنی رسوم کو مذہب کا نام دے کر بطور ضمیمہ زندگی اس سے واسطہ رکھنے کے جس طرح وہ عادی بن چکے تھے اس کے پیش نظر جب وہ دیکھتے کہ یہ مذہب آزادی و اباحت نفسانی کے تمام ناکوں پر اپنا نقیب اور داروغہ مقرر کر رہا ہے زندگی کے ایک ایک قدم پر جزا و سزا کا قانون سنا رہا ہے۔ اعمال و معاملات کے تمام متفرق جزئیات کو چن چن کر ایک نظام زندگی کے شیرازہ میں باندھتا جا رہا ہے۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہونا چاہتا ہے اور زندگی ہی نہیں بلکہ موت اور موت کے بعد تک بھی انسان اس کے متعین حدود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا، تو اس انقلابی تصورِ مذہب سے جس کی تشکیل میں

جاہلیت اور نفسانیت کو مطلقاً کوئی حق نہ دیا گیا تھا، وہ سخت نفرت اور اجنبیت محسوس کرتے مسلمانوں کی بے عقلی پر ماتم کرتے، اور ان پر آوازے کستے۔ ایک منافق نے حضرت سلمان فارسی سے ازراہِ طعن پوچھا۔ کیوں جی سنا ہے کہ تمہارے پیغمبر ہر چھوٹی بڑی چیز میں مذہبیت پیدا کرتے ہیں، حتیٰ کہ طہارت اور استنجاء کے اصول و آداب بھی بتاتے ہیں؟

گویا ان "روشن خیالوں" کے نزدیک "وہ" مذہب ہی نہیں جو ہر لمحہ انسانی اعمال و عقائد اور معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں لئے رہے۔

اسلام جس وقت آیا اس وقت "حکومت" کے متعلق ان لوگوں کی ذہنیت کا اندازہ کرو جو بادشاہت کو خواہشات نفسانی کا آلۂ کار سمجھتے تھے۔ جن کے یہاں حکومت کا استحقاق نسلی عصبیت اور آبائی وراثت کا رہینِ منت ہوا کرتا تھا۔ جو تختِ خسروی پر بیٹھ کر اپنے ہی جیسے انسانوں سے سجدہ کرانا اپنا بنیادی حق سمجھتے تھے۔ جن کے سروں پر خدمتِ خلق کے بارِ امانت کی جگہ جاہ و شوکت اور کبر و غرور کا تاج رکھا جاتا تھا۔ پھر یہ دیکھو کہ اسلام نے نفسانی جذبات، حیوانی رجحانات اور کبر و نخوت کے جاہلی تخیلات سے مجرد کر کے خلافت کا جو ٹھیٹھ عقلی اور اخلاقی نظریہ قائم کیا اس پر انہوں نے کتنی حیرت اور اجنبیت کا مظاہرہ کیا۔ صرف اظہارِ حیرت ہی نہیں بلکہ اسے سفاہت اور بے عقلی پر محمول کیا؛ اس کی ایک ادنیٰ مثال تم ایرانی

سردار کے دربار میں دیکھ سکتے ہو جہاں اسلامی سفیر ــــ جس کے صفحۂ دل سے جاہلیت کے نقوش مٹائے جا چکے ہیں اور جو توحید کا سبق پڑھ کر پتھر کے ساکت وصامت بتوں کی پوجا کے ساتھ ساتھ حکام اور سلاطین کے متحرک بتوں کی پوجا کی یاد بھی بھول چکا ہے ــــ صلح وجنگ کے معاملات پر گفتگو کرنے جاتا ہے اور خودی و تمکنت کی پوری شان کے ساتھ مکلف قالینوں کو روندتا، اپنے بھدے نیزے کی آنی ان میں گڑوتا ہوا تخت پر بادشاہ کے برابر جا بیٹھتا ہے۔ امرائے دربار اس بے باکی اور جسارت پر انگشت بدندان رہ جاتے ہیں کہ آخر یہ کس دربار اور مملکت کا آئین ہے کہ ایک معمولی سفیر حاکمِ وقت کو سجدہ کرنے کے بجائے اس مساویانہ شان کے ساتھ بادشاہ کے برابر جا بیٹھے۔ انسان پرست انسانوں سے دیکھا نہ گیا۔ تیوریاں چڑھ گئیں۔ یہ رنگ دیکھ کر توحید کا دیوانہ سفیر بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ اور یہ کہکر اٹھا اور چلا آیا۔ کہ کیا تم اپنے ہی جیسے آدمیوں کی پرستش کرتے ہو؟ کیا حکومت کا تخت بھی تمہارا مسجود ہے؟ یہ پیشانی تو صرف ایک ہی تخت کے سامنے جھکنا جانتی ہے جس کا نام عرش الٰہی ہے۔ سفیر کی یہ "بے ادبی" تہذیب و تمدن سے "ناآشنائی" اور "مجنونانہ بد دماغی" دیکھ کر انہوں نے کہا یہ کیسا غیر معقول مذہب ہے جہاں شاہ و گدا میں کوئی تمیز نہیں جو تخت و تاج کا احترام کرنا بھی نہیں جانتا۔

بیت المقدس کی فتح پر فاروقِ اعظم — وہ فاروق اعظم جن کا نام سن کر بڑے بڑے فراعنۂ وقت کے دل سینوں میں دہل جایا کرتے تھے۔ جب اس شان کے ساتھ شہر میں داخل ہوتے ہیں کہ ان کا غلام اونٹ پر بیٹھا ہُوا ہے، وہ خود اونٹ کی مہار ہاتھ میں تھامے پیدل چل رہے ہیں اور پھٹے پرانے، پیوند لگے ہوئے کپڑے جسم پر ہیں تو وہ عیسائی قوم جس نے بادشاہت کی قیصری شان دیکھی تھی اس عجیب منظر کو دیکھ کر تصویر حیرت بن جاتی ہے اسے یقین نہیں آتا کہ آیا خلیفہ اور بادشاہ کا جو خارجی مفہوم اس کی نگاہیں مشاہدہ کر رہی ہیں اس کا وجود بھی دنیا میں ہو سکتا ہے؟

اسلامی نظریہ خلافت کے سلسلے میں صلح و جنگ کی تعلیمات پر بھی ایک نگاہ ڈالیے کہ ان کے ساتھ جاہلیت نے کیا برتاؤ کیا، اور اس "غریب" نظریہ جنگ کی بے لوثی و بے غرضی اور خالص للہیت کو سمجھنے اور قبول کرنے سے اس نے کتنی بیگانگی اور وحشت محسوس کی۔ اسلام نے جب لوگوں کو دعوت دی کہ آؤ حق کی حمایت کرو، کفار کے بڑھتے ہوئے فتنوں کو دباؤ اور عدل کا بول بالا کرو، تو جہل و نفاق کے مریضوں نے سوال کیا۔ ہم یہ سب کچھ تو کرینگے مگر یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہمیں ملیگا کیا؟ اس کا جو جواب دیا گیا وہ یہ تھا کہ کچھ ملنے کی خاطر جو لڑائی کی جائے وہ جاہلیت کی لڑائی ہے۔ اسلام کی لڑائی تمام ذاتی اغراض سے پاک ہے۔ اپنی ذات سے مال خرچ کرو، اپنی رسد

خود لاؤ، اور اپنی جانیں قربان کرو، صرف اس لئے کہ خدا نے جو عدل اور نیکی کا قانون بھیجا ہے اس کی حکومت دنیا میں قائم ہو اور اس کے بندے اس قانون سے فائدہ اٹھائیں۔ اس خدمت کے معاوضہ میں اگر تم نے ایک اونٹ باندھنے کی رسی کا بھی لالچ کیا تو تمہاری سب قربانیاں اکارت جائیں گی۔ خدا کا دین تمہیں اس لئے لڑنے کی اجازت نہیں دیتا کہ مال و دولت کے خزانے اور دوسروں کو غلام بنانے کے اختیارات تمہیں حاصل ہو جائیں۔ ہم کفار سے اس لئے لڑنے نہیں جا رہے ہیں کہ ان سے ہمارا کوئی زور و زمین کا جھگڑا ہے یا کوئی ذاتی پرخاش ہے یا وطنی و نسلی عداوت ہے، ان اغراض کے لئے تلوار اٹھانا اور انسان کا خون بہانا تو قطعاً حرام ہے یہاں بجز دفع فساد و اعلائے کلمۃ اللہ کے اور کچھ مقصود نہیں۔ جن سے ہم لڑنے جا رہے ہیں اُن کی دشمنی نہیں بلکہ عین ان کی خیر خواہی ہمیں میدان جنگ میں لے جا رہی ہے۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو ہمارے بھائی ہیں اگر قانون الٰہی کی اطاعت پر راضی ہو جائیں تب بھی ہمیں اُن سے کوئی وجہ پرخاش نہیں۔ اگر وہ راہ خدا میں روڑے اٹکانے سے باز آ جائیں تب بھی ہماری ان کی دوستی ہو سکتی ہے۔

جب پیغمبر علیہ السلام نے جہاد اسلامی کی یہ غرض و غایت بیان کی تو جاہل انسان حیرانی میں پڑ گیا۔ وہ صرف دو ہی قسم کی لڑائیوں سے

واقف تھا۔ ایک وہ جو مال و دولت اور توسیع مملکت اور شہرت و ناموری کے لئے لڑی جائے۔ دوسری وہ جو فریق مقابل سے انتقام لینے کے لئے ہو۔ مگر ایسی لڑائی کا وہم و گمان بھی اس کے ذہن میں نہ تھا جو طمع اور انتقام دونوں کے جذبات سے خالی ہو، بلکہ محض فی سبیل اللہ ہو۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر یہ کس قسم کی جنگ ہے، ؟ میں اپنی جان جوکھوں میں ڈالوں اور معاوضہ میں کچھ بھی نہ چاہوں حتیٰ کہ یہ بھی نہ چاہوں کہ لوگوں کو میری بہادری کا حال معلوم ہو اور وہ میری تعریف کریں ! میں حریف سے لڑنے جاؤں نہ اس لئے کہ اس سے میری یا قوم و ملک کی عداوت ہے، بلکہ صرف اس لئے کہ اسے سیدھا راستہ دکھانا مقصود ہے ! جو شخص ابھی میرے بھائی کو قتل کر کے آیا ہے، اور ایک منٹ پہلے میری جان لینے کے درپے تھا۔ وہ محض کلمۂ شہادت پڑھ لے تو مجھ سے کہا جاتا ہے کہ اسے بھائی کی طرح گلے لگاؤں اور بھول جاؤں کہ وہ میرے بھائی کا قاتل اور خود میرے خون کا پیاسا تھا !

بدر کا معرکہ، جسے یوم الفرقان کہا گیا ہے، اسلامی تصور جہاد کی بلندی اور جاہلی تصور جنگ کی پستی کا بھی یوم الفرقان ہے ــــ عقل و دیانت اور نفس و جاہلیت کے دواعی پوری شدت کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابل آجاتے ہیں۔ اور ایک ہی ساعت میں اسلام کے انقلابی نظریات کا ایسا مظاہرہ ہوتا ہے کہ برسوں کی نشر و اشاعت میں بھی نہ ہوتا۔ مدعیان ایمان کی

کی جماعت تین گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو عقل و بصیرت کی نعمت سے اچھی طرح نوازا جا چکا ہے، جس کے دل و دماغ میں نفس پرستی اور جاہلیت کے نفوذ کی کوئی راہ نہیں ملتی۔ دوسرا گروہ متوسطین اور ضعفاء کا ہے جو اسلام کے عقلی نظریات کو ہضم کرنے سے ابھی تک قاصر ہیں۔ تیسرا گروہ عبداللہ ابن ابی اور اس کے منافقین کا ہے۔ جن پر جاہلی تصورات پوری طرح مسلط ہیں۔ ان تینوں جماعتوں کی حالتوں کا گہری نظروں سے مطالعہ کرو۔ پہلی جماعت تو وہی دیکھ رہی ہے جو قرآنی تعلیمات اور اصول کے اندر ان کی شفاف عقل اور بے آمیز فطرت انہیں دکھا رہی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اسلام ہتھیار اٹھانے کا مقصد کیا قرار دیتا ہے۔ اس کا سینہ قوم پرستی اور زر پرستی کے جذبات سے بالکل پاک ہے۔ اسے اس کا مطلق خیال نہیں کہ حریف اپنا ہی ہم قوم ہے اور ہمارے نیزے اپنے ہی دل و جگر کے ٹکڑوں پر پڑنے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اس وقت ان کے اندر اس قومی عصبیت اور حمیت کا بھی شائبہ تک موجود نہیں، جسکے لئے اپنے قبیلہ پر دوسرے قبیلہ والوں کو تلوار اٹھاتے دیکھنا بھی ناقابل برداشت تھا، کجا کہ دوسرے قبیلہ والوں کو خود ساتھ لے کر اپنے قبیلہ والوں پر چڑھ جانا۔ جاہلیت کے پرانے جذبات اسلام کے عقلی و فطری نظریات کے سامنے اس طرح دب کر فنا ہو چکے ہیں کہ ایک طرف یہ جماعت اپنے خونی بھائی

بندوں پر انصار کو حملہ کرنے کی اجازت اور ترغیب دے رہی ہے، دوسری طرف اپنی مادی کمزوری اور قلت سے ذرہ برابر بھی متاثر نہیں۔ اس نے ذہن نشین کر رکھا ہے کہ فتح و شکست کا مدار قلت و کثرت کے ماسوا کسی اور شے پر ہے جس کا نام توکل علی اللہ ہے۔ تیسری طرف میدانِ جنگ میں حصولِ غنائم کے بجائے صرف احقاقِ حق اور دفعِ باطل اس کے پیشِ نظر ہے اور اسلامی رُوحِ جہاد اس طرح اس کی روح سے ہم آغوش ہو چکی ہے کہ وہ مال و زر سے لدے ہوئے قافلہ کو چھوڑ کر شمشیر و سنان سے مسلح فوج کے مقابلہ پر جانے کو ترجیح دیتی ہے۔ حالانکہ یہ جماعت اس ماحول کی تربیت یافتہ رہ چکی ہے جہاں اس حیرت انگیز انقلابی نظریہ کا خیال ہی پیدا ہونا سرے سے ناممکن تھا کہ لڑائی انتقام یا حصولِ غنائم کے ماسوا بھی کسی غرض کے لئے لڑی جا سکتی ہے، یا فتح کا انحصار مادی قوتوں کی فراہمی کے علاوہ بھی کسی شے پر ہے، یا باپ بیٹے بھی ایک دوسرے کے مقابل آ سکتے ہیں۔

دوسری جماعت خوف سے ہراساں ہو رہی ہے۔ وہ تیر و سنان کے مقابل میں توکل کی طاقت کا تصور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس پر اس حقیقت کا انکشاف دشوار ہو رہا ہے کہ اللہ کی تائیدِ غیبی ان مخلص مجاہدین کے کیونکر شاملِ حال ہوتی ہے جو اس کے حکم کے مطابق اپنی تمام مادی قوتوں کو جمع کر کے باطل کے مقابل میں لا کھڑا کرتے ہیں اور اس کے بعد صرف اللہ

پر بھروسہ کر کے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس قصور نگاہ کے ساتھ وہ مقاصد جنگ کی اسلامی اسپرٹ کا بھی احاطہ نہ کر سکی۔ قریش کے لشکر کی طرف منہ کرتے ہوئے تو اس پر نزع کی سی حالت طاری ہونے لگتی ہے لیکن نہتے تجارتی قافلہ پر پل پڑنے کے لئے وہ ہمہ تن تیار ہے اور نبی کو اسی کا مشورہ دے رہی ہے۔

تیسری جماعت نے حسب توقع نہ صرف جنگ میں عملاً شریک ہونے اور صبر و توکل کی طاقت کا اندازہ لگانے میں اپنے عجز کا ثبوت دیا۔ بلکہ اس نے عجیب و غریب حرکت کا مذاق بھی اڑایا، قافلہ کے سہل الحصول مال و متاع کو چھوڑ کر قوی تر دشمن سے لڑنے کے لئے جانے پر سخت حیرانی کا اظہار بھی کیا، مسلمانوں کی خود فریبی پر بزرگانہ ماتم بھی کیا اور جب دیکھا کہ ان کا ایمان اور توکل انہیں قریشی سیلاب کی ہیبت ناکیوں سے اس طرح بے خبر کئے ہوئے ہے تو بول اٹھے۔

غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ (انفال - ۷) ان کے دین نے انہیں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔

اور اسکی وجہ بھی صاف ہے، جنگ کا یہ تصور اور فتح و شکست کا یہ فلسفہ ان کے ذہن میں کیونکر آسکتا تھا جن کے نزدیک قوت کا منتہا لات و عزیٰ کے حقیر پتھروں تک اور اغراض جنگ کا بلند ترین تخیل حصول غنائم تک محدود تھا، جاہلیت کے جو اسباق انھوں نے پڑھے تھے ان میں اس کا کوئی

ذکر تو تھا نہیں کہ جو قوم محض اللہ کے لئے، نظامِ عالم کی برہمی اور شورش کو امن و عدل سے بدل دینے کے لئے اور سرکش و بے راہرو انسانوں کو سارے نظامِ کائنات سے ہم آہنگ بنانے کے لئے میدان میں آتی ہے وہ تنہا نہیں ہوتی، اس کی مدد کے لئے آسمان سے ملائکہ آتے ہیں بلکہ تمام عناصر عالم کی ہمدردی اور حمایت اسے حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی اسی مشینری کے اجزا ہیں جسے یہ لوگ درست کرنے اٹھے ہیں۔

وطن پرستی اور قومیت کا غرور دونوں چیزیں جاہلیت کے اصول موضوعہ میں سے تھیں۔ اپنی نااہلی کے باوجود اپنے ملک پر حکومت کرنا، اس میں عزت کی زندگی بسر کرنا ملک کے باشندوں کا پیدائشی حق تھا۔ اپنی صالحیت، عدل پروری اور نیکوکاری کی بنا پر کسی جماعت کا بلا امتیاز قوم و وطن، حقدار حکومت ہونا بالکل ایک اچھوتا اور ناقابلِ فہم تخیل تھا۔ لیکن جب خلافتِ الٰہی کی تجدید کا وقت آیا تو قومیت اور وطنیت کا بت توڑ کر اعلان کر دیا گیا کہ :-

اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ۔	بے شک زمین کے وارث خدا کے صالح بندے ہیں۔

استحقاقِ حکومت کی یہ نامانوس صدا کانوں میں پڑی تو قوم پرست منافقین کے سینوں میں آگ لگ گئی۔ قوم پرستوں کے سردار رئیس المنافقین

عبد اللہ ابن ابی نے اس نئے آیڈیل کو ناکام بنانے کی پے بہ پے کوششیں کیں۔ وہ انصار اور مہاجرین کی اسلامی قومیت کو کسی طرح نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس کی نگاہ میں یہ دو الگ قومیں تھیں اور وہ ہجرت کے معاملہ کو اس نظر سے دیکھتا تھا کہ ایک غیر قوم کے لوگ باہر سے آکر مذہب کے نام سے اس کی قوم کو اپنے نفع کے لئے استعمال (exploit) کر رہے ہیں۔ اسے انصار پر حیرت ہوتی تھی کہ یہ کیوں اپنی پرانی قومیت کے تخیل کو بھول کر نئی قومیت کا "چکمہ" کھا رہے ہیں۔ وہ اور اس کے ہم خیال منافقین، جو سب کے سب انساب و اوطان کو بنائے قومیت سمجھتے تھے، ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ انصار میں قدیم جاہلیت کے جذبات کو تازہ کریں اور مہاجرین سے ان کو الگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ مدینہ میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان یہ ایک مستقل کشمکش تھی جو کئی سال تک جاری رہی۔ ایک طرف اسلام پوری طاقت کے ساتھ دماغوں میں اس انقلابی نظریہ کو اتار رہا تھا جس کی رو سے انسانیت کی تقسیم بجز کفر و دین کے اور کسی بنیاد پر نہیں ہو سکتی۔ اور دوسری طرف جاہلیت ایک ایک قدم پر اس کی راہ روکتی اور اپنے پرانے نظریۂ قومیت کو سامنے لاتی تھی۔

غزوۂ بنی المصطلق میں کسی چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر جہجاہ

ابن مسعود) نے ایک انصاری (سنان الجہنی رضؓ) کو طمانچہ مارا، انصاری نے قدیم دستور کے مطابق یا للانصار! کا نعرہ لگایا، مہاجر نے بھی مہاجرین کی دہائی دی، چشم زدن میں تلواریں بے نیام ہوگئیں۔ اگرچہ فوراً ہی اسلامی اخوت نے آکر جاہلیت کی اس چنگاری کو بجھا دیا۔ لیکن عبداللہ بن اُبی کے دل کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے اوس و خزرج کے پرانے نظریات اور قومی جذبات کو ابھارتے ہوئے کہا:۔

سَمِّنْ كَلْبَكَ يَأْكُلْكَ اِنَّا وَاللّٰهِ لَئِنْ رَجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ۔

اپنے کتے کو خوب موٹا کرو تاکہ وہ تمہیں پھاڑ کھائے! خدا کی قسم اگر ہم مدینہ لوٹے تو عزت رکھنے والا (یعنی خود) ذلیل کو (یعنی سرکار عالم اور مہاجرین کو) نکال باہر کریگا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اے انصار تم نے اس سانپ کو خود آستینوں میں پالا ہے، نتیجہ دیکھتے ہو کہ وہ تمہارے منہ آرہے ہیں، تمہاری پناہ میں رہکر اور تمہاری روٹیاں کھا کر اب تمہارے ہی اوپر اپنا اقتدار جمانا چاہتے ہیں۔ یہ کتنی عجیب اور ہمارے لئے رسوا کن بات ہے کہ ایک بیرونی قوم ہماری قومی عزت اور خود داری کو ڈھانے اور اس پر اپنی فرمانروائی کا تخت بچھانے کا حوصلہ کر رہی ہے اور حکومت و خلافت کا یہ پُر فریب نظریہ پیش کر رہی ہے کہ اللہ کی زمین محض اس کے صالح بندوں

کی وراثت ہے اس پر حکومت کرنا انہیں کا حق ہے اور قومیت و وطنیت کے سارے فطری حقوق بے معنی ہیں؛

مساوات کا مقام انسانیت کے بنیادی حقوق میں جس قدر بدیہی اور نمایاں ہے، دنیا اسی قدر اسے فراموش کر چکی تھی۔ اہل عرب کا دستور تھا کہ اگر کسی معمولی قبیلہ کا کوئی فرد کسی دوسرے معزز قبیلہ کے کسی فرد یا کسی بڑے سردار کو قتل کر ڈالتا تھا تو اس کے قصاص میں قاتل کے ساتھ ساتھ اس کے خاندان کے متعدد بے گناہ اشخاص بھی قتل کئے جاتے تھے، یعنی ایک صاحب جاہ و حشمت انسان کا خون معمولی انسان کے خون سے دس بیس گنی زیادہ قیمت رکھتا تھا۔ غربت و امارت کا یہی جاہلی امتیاز اہل کتاب کے اندر بھی قبولیت حاصل کر چکا تھا۔ ان کے تعزیرات شرعی کی یہ ایک متفق علیہ دفعہ تھی کہ اگر کوئی بڑی ناک رکھنے والا آدمی جرم زنا کا ارتکاب کرے تو اسے کوڑے مارنے کی سزا دی جائے اور اگر بدقسمتی سے زانی کوئی معمولی اور کم حیثیت انسان ہو تو اس پر حد رجم جاری کی جاتے۔

اسلام نے جب حقیقت کے مٹے ہوئے نقوش ابھارنے شروع کئے تو قانون مساوات کو بھی از سر نو زندہ کیا، اور اسے اپنے نظام سیاست کا سنگ بنیاد قرار دے کر اعلان کر دیا کہ قانون الٰہی کی نگاہ میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں سب کے حقوق کی حرمت یکساں ہے حتیٰ کہ اگر خود نبی کی بیٹی اور اسکی

نورِعین چوری کرے تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ لئے جائیں گے۔ لیکن جاہ پرست دنیا اس ہتک کو برداشت نہ کر سکی۔ خلیفہ دوم کے عہد میں ایک نومسلم رئیس (جبلہ بن ایہم غسانی) حج کے لئے آیا۔ اثنائے طواف میں کسی معمولی انسان سے دھکا لگ گیا۔ اس کی رئیسانہ تمکنت اس گستاخی کو گوارا نہ کر سکی اور اس نے فوراً ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ معاملہ کورٹ میں پہنچا۔ عدل فاروقی نے فیصلہ دیا کہ مظلوم اپنے ظالم کے چہرہ پر اتنی ہی شدت کا طمانچہ مارے۔ وہ رئیس حیرت سے منہ تکتا رہ گیا۔ آخر یہ حیرت ارتداد تک پہنچی۔ اس نے کہا مجھے تو اس اندھیر کا وہم و گمان بھی نہ تھا جس مذہب کے قانون میں شریف و رذیل کا کوئی امتیاز نہ ہو اس پر ایمان لانا عقل و ضمیر کی توہین ہے۔

جاہلیت کی سوسائٹی مختلف طبقات میں بٹی ہوئی تھی جس میں شریف و وضیع، امیر و غریب، عالی نسب، کم نسب کے بہت سے مراتب تھے۔ اور ان مراتب میں سب سے نیچا درجہ غلاموں کا تھا۔ اسلام نے سرے سے طبقات کی اس تقسیم ہی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ سب انسان مساوی الاصل ہیں اور ان میں بجز تقوٰی کے اور کوئی معیار بزرگی و خوردی نہیں۔ یہ انقلابی نظریۂ مساوات ذوق جاہلیت پر سخت گراں گذرا، کیونکہ تفاخر ہی تو نفسِ حیوانی کی رگ جان ہے۔ اسلام نے جب اس

پر نشتر چلایا تو جاہلیت بلبلا اٹھی۔ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن سردار قریش عبدالمطلب کی نواسی اور عرب کے سب سے اونچے خاندان کی بیٹی زینب بنت جحش کی شادی ایک ایسے شخص سے کردی جو صفات کی جاہلی تقسیم میں سب سے نیچے درجے پر تھا یعنی آزاد کردہ غلام (حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ) جاہلیت اس شدید انقلابی حرکت پر اس قدر چراغ پا ہوئی کہ بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔ مدینہ کے منافقین ڈر گئے کہ یہ وبا کہیں پوری سوسائٹی میں نہ پھیل جائے۔ ان کی عورتوں نے اس کے خلاف چرچے شروع کئے۔ خود حضرت زینب کو ورغلانا اور عار دلانا شروع کیا اور جاہلی جذبات کو بھڑکا کر انہیں اتنا برانگیختہ کیا کہ آخر کار زوجین میں منافرت پیدا ہوگئی، اور طلاق ہی نے اس قضیہ کو طے کیا۔

غلام کی طرح قیدی بھی انسانی مراعات کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بدر کے قیدیوں کو جب صحابہ کرام نے حسب ارشاد نبوی روٹی کھلائی اور خود کھجوروں پر اکتفا کرنے لگے، تو قریش کے اسیران جنگ مارے شرم کے گردنیں جھکا لیتے اور حالت حیرانی میں اپنے دلوں سے پوچھتے کیا اس آسمان کے نیچے قیدی کے ساتھ یہ برتاؤ بھی ہوتا ہے؟

عرب کا معاشرتی نظام رسوم جاہلیت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کھانے پینے میں نشست و برخاست میں نکاح و طلاق میں من گھڑت قیود مذہبی

اصول کی حیثیت سے داخل نہیں اور ان کا توڑنا سوسائٹی کی نگاہ میں بد ترین گناہ تھا۔ ان رسمی تصورات میں سے ایک یہ بھی تھا۔ کہ متبنّیٰ اصل بیٹے کا حکم رکھتا ہے اور اس کی بیوہ یا مطلقہ بیوی سے شادی کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح اصل بیٹے کی بیوی سے۔ حضرت زینب کو جیسا کہ اوپر گذر چکا ایک غلام سے رشتہ ازدواج، منافق عورتوں کے طعن و تشنیع اور آخر میں مطلقہ ہو جانے کے جو پیہم صدمات پہنچے تھے ان کا مداوا صرف ایک طریقہ سے ممکن تھا، وہ یہ کہ انہیں ام المومنین کا درجہ عطا کیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ خواہش دل میں رکھتے تھے لیکن سوسائٹی کی جاہلانہ ذہنیت سنگِ گراں بنکر راستے میں حائل تھی۔ قرآن نے حکم دیا کہ اس جاہلانہ تصور پر بھی ایک کاری ضرب لگاؤ اور ان رسم پرستوں کی کچھ پرواہ نہ کرو:۔

وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ۔	تم اپنے دل میں وہ بات چھپاتے ہو جسے اللہ ظاہر کرنے والا ہے۔ تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ اس امر کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔
(احزاب)	

آخر کار جب خدا کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب سے نکاح کر لیا تو منافقین میں پھر وہی شور برپا ہوا جو پہلے حضرت زیدؓ سے

نکاح کرنے پر بڑا تھا۔ انہوں نے ایک قدیم سنت کی خلاف ورزی پر طاعن کی بوچھاڑ کر دی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اپنی بہو سے بھی نکاح کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ لیکن پیغمبر آخرالزمان کی بعثت تو اس غرض کے لئے تھی ہی کہ وہ خود ساختہ رسوم و قیود کے تاروپود بکھیر کر رکھ دیں۔ رحمتہ للعالمین کا منصب یہ بھی تو تھا کہ انسان کو ان زنجیروں سے نجات دلائیں جو اس نے اپنی ناسمجھی سے خود اپنے پاؤں میں ڈال لی تھیں اور وہ بوجھ اس کے سر سے اتاریں جنہیں اس نے خود اپنے اوپر لادا تھا اور خود ہی ان کے نیچے پس رہا تھا۔ لہذا منافقین کے اس تمام شور و غوغا کے باوجود حق کی تلوار نے بے نیام ہو کر اس قید بیجا کو کاٹ ڈالا۔

جو قوم حقایق کو چھوڑ کر ظواہر پر اپنا نظام عمل مرتب کرتی ہے جنکی تہ میں نیکی اور تقوی کے عناصر موجود نہیں ہوتے اس پر کسی رسم یا قدیم رواج کی مخالفت نہایت شاق گذرتی ہے کیونکہ یہی رسوم تو اس کے دین و دنیا کی کل کائنات ہوتی ہیں۔ اس کی نگاہ میں ان ظاہری بندشوں کی عظمت اصل دین کی عظمت سے زیادہ ہوتی ہے اور جب ظاہری پردوں کو چاک کر کے اصل روح اور مقصد کی طرف ان کی رہنمائی کیجاتی ہے تو دفعتہً ان کے رگ و پے میں نفرت اور جاہلی حمیت آتش سیال بن کر دوڑنے لگتی ہے وہ اشکال اور مظاہر کی تبدیلی کو اصل مقصد اور حقیقت کی تبدیلی خیال کرتے ہے

مخالفت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تشریع اسلامی کے دوران میں اس ذہنیت سے بھی اسلام کو سخت مقابلہ پیش آیا جب تحویل قبلہ کا حکم آیا تو بہت سے منافق علانیہ مرتد ہو گئے۔ قرنوں سے بیت المقدس قبلہ چلا آرہا تھا۔ اور اسلام نے بھی ابتداءً ایک مدت تک اس کو قبلہ بنایا تھا۔ اس لئے وہ جاہل یہ سمجھتے تھے کہ قبلیت ایک خاص سمت اور مقام سے قدرتی تعلق رکھتی ہے۔ اب جو قبلہ بدلا گیا تو انہوں نے کہا یہ کیا تماشہ ہے کہ خدا بیت المقدس سے نکل کر کعبہ میں آبیٹھا ؟ کیا اب تک جتنی نمازیں اس طرف رخ کرکے پڑھی گئیں سب غیر اللہ کے لئے تھیں ؟ قرآن نے تحویل قبلہ کی حکمت بیان کرکے ان کے اس جاہلی تصور کو دور کرتے ہوئے جواب دیا کہ قبلہ کوئی مقصود بالذات شئے نہیں مشرق و مغرب سب خدا ہی کا ہے۔ جس طرف تم رُخ کرو وہیں خدا موجود ہے کسی سمت خاص کو اس کی نگاہوں میں فضیلت اور محبوبیت حاصل نہیں، نہ کسی جہت میں وہ محصور ہے اور نہ کسی قبلہ کی طرف رُخ کرنا بجائے خود نیکی اور تقویٰ ہے بلکہ ثواب اور نیکی درحقیقت ایمان اور اعمال صالحہ کا نام ہے لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ الخ لیکن جاہلیت اور ظواہر پرستی کی ماری ہوئی عقل اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کب تیار تھی۔ کتنے ہی مذبذب اور کتنے ہی مرتد ہو کر رہ گئے۔

اسلام نے جب آنکھیں کھولیں تو اس کے اردگرد معاشیات اور اقتصادیات کا ایک خالص ظالمانہ نظام قائم تھا جسکی پوری عمارت رہزنی اور سنگدلی پر کھڑی کی گئی تھی۔ غریب پر گویا رزق کے دروازے بند تھے۔ پیسہ ان کے ہاتھ میں آنے کا کوئی رستہ نہ پاتا تھا۔ مگر ہاتھ سے جانے کے بہتیرے راستے تھے۔ اس کے برعکس عیش پرست امرا کے ہاتھ میں وہ صرف آنا جانتا تھا نکلنے کی کوئی اختیاری راہ نہ پاتا تھا۔ اسلام اس دردانگیز منظر کی تاب کہاں سے لاتا۔ اس نے دولت مندوں کو کسب مال کے جائز حقوق دیتے ہوئے بقیہ تمام جارحانہ اور غیر عادلانہ طریقوں سے روک دیا۔ فقراء ومساکین کی معاشی فلاح کے لئے دو اصول متعین کئے۔ ایک تو فرضیت زکوٰۃ، دوسرا تحریم ربوا، کیونکہ ربوا وہ خونخوار درندہ ہے جو مفلس و ناتواں حاجت مندوں ہی پر جھپٹتا اور ان کا خون چوس کر انہیں موت کی آغوش میں ڈالتا ہے۔

صدقہ و زکوٰۃ کا فلسفہ اور مصرف شارع نے جب یہ بتایا:

تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَاءِ کُمْ	یہ صدقہ تمہارے مالداروں سے لیکر تمہارے
وَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَاءِ کُمْ۔	فقراء پر خرچ کر دیا جاتا ہے۔

اور لوگوں کو اس پر ابھارا تو کفار و منافقین نے کہا:

قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ	(انفاق کا حکم سن کر) کفر کرنیوالوں نے
اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ	مومنوں سے کہا کیا ہم اس شخص کو کھلائیں

اللّٰہُ اَطۡعَمَہٗۤ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (یٰسین - رکوع ۳)
جس کو اگر اللہ چاہتا تو کھلا دیتا۔ تم تو بالکل صریح گمراہی میں ہو۔

یعنی یہ صدقہ و زکوٰۃ کیا چیز ہے؟ اگر خدا ان ننگوں کو کپڑا اور بھوکوں کو کھانا دینا چاہتا تو اسے کون روک سکتا تھا۔ اس کی مشیت نے انہیں اس نعمت کا مستحق سمجھا ہی نہیں، پھر جسے اس نے بھوکا رکھا اس کو کھانا دینے کی جسارت ہم کیوں کریں، اور وہ ہم پر یہ فریضہ عائد کیسے کر سکتا ہے؟ یہ بات تو بڑی ہی عجیب ہو گی۔

سود کی ممانعت تو ان کے نزدیک سرے سے کسی توجہ کے قابل بھی ہی نہیں کیونکہ انہیں اس میں معقولیت کا کوئی پہلو نظر آتا ہی نہ تھا۔ ان کا قول تھا کہ:۔

اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا (بقرہ)
تجارت تو ربوا ہی کی طرح ہے۔

یعنی بجائے اس کے کہ سود کی اباحت کے لئے وہ اُسے بیع کے مماثل قرار دیتے اور بیع کی اباحت کو بطور اصل تسلیم کرتے ہوئے ربوٰ کے جواز کے لئے اُسے بیع کے ساتھ تشبیہ دیتے، انہوں نے حلت ربوا ہی کو اصل قرار دیکر تجارت کو اس سے تشبیہ دی گویا سودی منافع کی علت تو قطعی اور بحث و تمحیص سے بالکل بے نیاز ہے ہاں منافع تجارت کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے اتنا کہنا پڑے گا کہ اس کی نوعیت بھی ربوا کی سی ہے جو مباح الاصل ہے، یہ

تھا نفس حیوانی کا کرشمہ!

یہاں استقصار مقصود نہیں بلکہ مثالاً ان واقعات کی طویل فہرست کا ایک صفحہ پیش کر دیا گیا ہے جو اسلام اور جاہلیت کی ابتدائی جنگ میں منظر عام پر آئے، اور یہ واقعات بھی محض قولی ہیں یعنی ان کے ذریعہ اسلام سے جاہلیت کی فطری اجنبیت اور وحشت کا افسانہ حقیقت ہم خود اسی کی زبان سے سن رہے ہیں۔ ورنہ اگر جاہلیت کے عملی واقعات اور اس کے عام نظریات کو قلمبند کیا جائے اور اُن سے اسلامی تعلیمات و اصلاحات کا موازنہ کیا جائے تو شاید دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہونگے۔ پھر بھی جو معدودے چند واقعات اوپر کی سطروں میں بیان کئے گئے ہیں اتنے ہی تصویر کے اصلی خط و خال نمایاں کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جاہلیت اور نفسانیت کی غلام دنیا نے قرآن کی فطری تعلیمات اور عقلی تصورات کے ہر ہر جزئیہ سے کتنی بیگانگی کا ثبوت دیا ہوگا اور اسلام کی "غریب" آواز سُن کر حیرت اور استہزار کے کتنے بلند قہقہے فضا میں گونج اُٹھے ہونگے، جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس بظاہر "اجنبی" اور "غیر مانوس" صدا پر جن پاک نفسوں اور سچی بصیرت رکھنے والوں نے ابتدا میں لبیک کہی وہ خود اجنبی اور قابل صد طعن و تشنیع بن گئے تھے۔

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مجرمین ایمان لانے والوں پر ہنستے تھے۔

مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ	وہ جب ان کے قریب سے گذرتے تو باہم
وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ	(از راہ طعن و تمسخر) اشارے کرتے ہوئے،
وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ	اور جب اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹتے
انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ (تطفیف-۱)	تو نشاط سے چہکتے ہوئے۔

گویا ان کا وجود ہی سراپا عجائب کدہ بن گیا تھا۔ پھر وہ وقت آیا کہ یہ اجنبیت ناقابلِ معافی جرم قرار دے دی گئی، زبانی چھیچے تلواروں کی جھنکار میں تبدیل ہو گئے اور جاہلیت نے اپنی حیرت کو غیظ و غضب سے بدل کر آہنی زنجیروں اور تیر و سنان کی نوکوں سے اس نامانوس آواز کو دبانا شروع کر دیا، اگرچہ قدرت اس کے حوصلوں کے نامراد ہونے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

نظریہ بدء الاسلام غریبًا کے شواہد

یہ ہے "بدء الاسلام غریبًا" کی اصل تصویر۔ لیکن اگر اس تصویر کو اور زیادہ نمایاں دیکھنا ہو، اور اس امر کا اندازہ لگانا مقصود ہو کہ نظریاتِ اسلامی اپنی ٹھیٹھ عقلیت کی بنا پر کس قدر "غریب" ہیں اور ذہن انسانی کی گرفت میں آنے کے لئے کتنی اعلیٰ درجہ کی عقلی اور اخلاقی تربیت چاہتے ہیں، تو ان بندگانِ جہل کو چھوڑ کر آگے چلو اور دیکھو کہ وہ گروہ جو انتہا درجہ کا پاک طینت اور سلیم الفطرت تھا، جو صداقت کو پہچاننے اور ماننے میں کمال درجہ پر پہنچا ہوا تھا، جس نے نفس پرستی اور

جاہلیت کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے ہیں نور نبوت کو پاکر اپنی صحتِ نظر کا ثبوت دید یا تھا، جو عند اور شقاق سے پاک، اتباعِ نفس سے آزاد، اور شرحِ صدر کی نعمت سے بہرہ ور تھا، وہ بھی اسلام و جاہلیت کے اس معرکہ میں کتنی کشمکش سے دوچار ہوا، اسلام کی انتہائی عقلیت کو پوری طرح ذہن نشین کرنے ہیں اس کو بھی کتنا سخت مجاہدہ کرنا پڑا، کس کس طرح جاہلیت نے چور دروازوں سے غیر محسوس طور پر اس کے اندر نفوذ کرنے کی سر توڑ کوششیں کیں اور کیسی زبردست اخلاقی ٹریننگ اور انقلابی تعلیم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس قابل بنایا کہ نفسانی خواہشات اور موروثی افکار اور عصری تصورات سے بالکل آزاد ہو کر ٹھیٹھ فطری حقایق، اور خالص معقولات کا ادراک کر سکے۔ اس منظر کو دیکھ کر آدمی ششدر رہجاتا ہے، اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ افراط و تفریط کے ہنگامہ زار ہیں خالص عقلی اور فطری اعتدال کی بال سے زیادہ باریک راہ کا ادراک کرنا اور قوت تمیز و قوت ارادی کی کامل بیداری کے ساتھ اس پر ثابت قدم رہنا کس قدر کٹھن کام ہے، اور کیسا انسان کامل تھا وہ بشر جو نہ صرف خود اس راہ پر کمال درجہ استقامت کے ساتھ چلا، بلکہ جس نے دوسرے انسانوں کو بھی اپنی تعلیم و تربیت سے اس پر چلنے کے قابل بنایا۔

اب اس اجمال کی تفصیل سنو، یعنی اس نظریہ کے شواہد۔

مبادی اسلام (توحید، معاد اور نبوت) سے اس گروہ کو اگر کوئی اجنبیت ہوسکتی تھی تو وہ قبول اسلام سے پہلے تک تھی۔ اسلام میں داخل ہوجانے کے بعد اس کے ظہور کا کوئی موقع باقی نہ تھا۔ کیونکہ حکمت الٰہی نے نبوت کے تیرہ برس محض اسی جڑ کی مضبوطی میں صرف کردیئے تھے۔ جس سے دینِ فطرت کے تمام برگ و بار نکلنے والے تھے۔ اس نے جاہلیت کے اقنومِ اعظم (شرک) پر پے بہ پے ایسی کاری ضربیں لگائیں کہ دوبارہ اس کا سر اٹھانا ناممکن ہوگیا۔ موسوی امت تو ایمان لانے کے بعد بھی بتوں اور مجسموں کو دیکھ کر بے تابانہ سربسجود ہوجانا چاہتی تھی؛ مگر صحابۂ کرام کی تعلیم و تربیت اتنی مکمل ہوئی تھی کہ وہ انہیں اپنے پیروں سے مس کرنا بھی ذوقِ ایمان کی حق ناشناسی خیال کرتے تھے۔

لیکن اسلام کا فلسفۂ توحید اور لا الٰہ الا اللہ کا سرِ نہاں؛ اللہ اکبر! اس کی گہرائی اور بے کرانی کو ہضم کرنے کے لیے صدیقِ اکبر اور فاروقِ اعظم کا ظرف چاہیے۔ اسلام نے اگر شجر حجر جیسی ادنیٰ مخلوق کے سامنے سے انسانی پیشانیوں کو اٹھا کر سربلند کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کیا کہ بڑے سے بڑے انسان کو بھی خدائی کے تخت سے اتار کر عام انسانوں کی طرح عجز و نیاز کی سطح پر لا کھڑا کیا اور بتایا کہ خدا نے کسی ذاتِ بشری کو کوئی امتیازی حق نہیں دیا ہے اس کی سنت سب کے لیے ایک ہے۔ فطرت کے نوامیس کسی شخصیت کا خاص

احترام کرنا نہیں جانتے۔ اگر کسی کو کوئی شرف ہے تو محض اس کے آگے جھکنے کا ہے، ورنہ قدرت اور عزت سب اسی ہستیٔ مطلق کے لئے ہے۔ باقی ساری کائنات بے چارۂ محض ہے، اور اس بیچارگی میں سب برابر ہیں لیکن دنیا تو ہر بلندی کے آگے سر ٹیک دینے کی خوگر تھی اور ہر بزرگ انسان کو مقام بشر سے کچھ نہ کچھ برتر ہی سمجھتی آرہی تھی۔ چنانچہ اس تخیل کا اثر مٹتے مٹتے بھی کبھی کبھی نمایاں ہو جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یکسالہ لخت جگر حضرت ابراہیم نے جس دن وفات پائی اتفاق سے وہی سورج گرہن کا دن تھا۔ بعض صحابہ کرام نے اسی قدیم تخیل کے مطابق گمان کیا کہ آج کا گرہن جگر گوشۂ رسول کی وفات کا نتیجہ ہے۔ حضور نے فوراً اس نظریہ کی اصلاح کی۔ اور لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ چاند اور سورج خدا کی قدرت کے نشان ہیں کسی کے مرنے جینے سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔ کوئی انسان خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو نظام کائنات پر کوئی حق اور اثر نہیں رکھتا۔ جس قانونِ بے اختیاری کے ماتحت ایک بھکاری مرتا ہے اور زمین و آسمان اس کا ماتم نہیں کرتے، اسی کے مطابق سلطانِ وقت بلکہ پیغمبر بھی مرتا ہے اور نہ زمین اس سے متاثر ہوتی ہے، نہ آسمان آنسو بہاتا ہے، نہ چاند سورج گرہن کا ماتمی لباس پہنتے ہیں۔

غالباً یہی شخصی عصمت کا تخیل تھا جس نے رحلت مصطفوی کے وقت

اضطراری طور پر حضرت عمرؓ تک کو تھوڑی دیر کے لئے مغلوب کر لیا تھا۔ اگرچہ قرآن نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی خدا کے قانون سے مستثنیٰ نہیں، رسول اعظم ہو یا حقیر ترین انسان موت سب کو آنی ہے :-

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (زمر-۳) اے پیغمبر بلا شبہ تم بھی مرنے والے ہو اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں۔

حتیٰ کہ اس نے "اِنَّكَ مَيِّتٌ" کے ظہور کے لئے کسی خاص وقت کی تعیین بھی نہ کی تھی، کفر کی شکست حق کی فتح، اعداء کی بیخ کنی اور اسلام کے فروغ کا جو وعدہ تھا اس کے بارے میں بھی رب العزت نے نہایت بے نیازی سے آگاہ کر دیا تھا کہ "تمہاری زندگی ہی میں اس وعدہ کا ایفا کچھ ضرور نہیں، اگر ہم چاہیں گے تو وہ وقت دکھا دینگے اور اگر چاہینگے تو اس سے پہلے ہی تمہیں اٹھا لینگے" وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (رعد-۶) لیکن ان تمام تصریحات کے باوجود اس جگر گداز خبر کو سن کر کہ آنحضور صلعم نے وفات پائی، حضرت عمرؓ جیسا اعلیٰ تربیت یافتہ مسلمان بھی وفور جذبات میں توازن کھو دیتا ہے، تھوڑی دیر کے لئے بھول جاتا ہے کہ قضائے الٰہی کے سامنے بالا و پست سب

ایک ہیں، اور حیران ہو ہو کر سوچتا ہے کہ اتنی بڑی ہستی کس طرح اس معمولی انداز سے گذر جا سکتی ہے! پیغمبرانہ شخصیت کی بزرگی کا جو سکہ نفس میں مرتسم تھا اس کی بنا پر وہ آپ کی وفات کا یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ "تلوار کھینچ کر بولے" اگر کسی نے یہ کہا کہ رسول اللہ کا انتقال ہو گیا تو اُسے قتل کر دوں گا"۔ اس وقت وہ شخص اٹھا جو اسلام کی اسپرٹ کو جذب کرنے میں انبیا کے مقام کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے آیت اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ پڑھ کر بشریت اور الوہیت کے فرق کو واضح کیا اور فرمایا، "جو تم میں سے محمد صلعم کو پوجتا تھا وہ جان لے کہ محمد صلعم وفات پا گئے۔ لیکن جو اللہ وحدہٗ لاشریک کا پرستار تھا اسے معلوم ہو کہ اللہ زندہ ہے"۔ یہ سن کر حضرت عمر کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے ایسا محسوس[۳] کیا کہ کوئی چیز یکایک ان کو بے ہوشی سے ہوش میں لے آئی ہے۔

اسلام کے اُس جامع اور عظیم الشان نظریۂ مذہب کو لو جسے وہ کہیں وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ کے الفاظ میں بیان کر کے ساری کائنات ارضی و سماوی کے ایک ایک ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت کو "اسلام" سے تعبیر کرتا ہے۔ کہیں یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کہہ کر اعلان کرتا ہے کہ ماہتاب کی ضیا پاشی آفتاب کی حرارت رسانی، لیل و نہار کی آمد و رفت، سیارگان فلک کی گردش، زمین

کی روئیدگی، آگ کی تپش، یا پانی کی روانی، یعنی عناصر کائنات کی ایک ایک قوت و فعل "تسبیح الٰہی" ہے، اور کہیں پھر اسی اصول کے تحت مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ، کہکر انسان کے ہر قول و عمل اس کے تمام افکار و عواطف اور اس کے سارے عقائد اور معاملات کو بشرطیکہ اسی رب السمٰوٰت والارض کے متعین کئے ہوئے حدود کے اندر ہوں، عبادت بتلاتا ہے۔ اسلام اور تسبیح و تعبد کے اس عظیم الشان اور وسیع نظریہ کو جس کی پہنائی انسان ہی پر نہیں، کونین پر چھائی ہوئی ہے، اپنے اندر جذب کر لینے میں صحابہ کرام کو بھی حیرت و استعجاب کے صدہا مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فی بضع احدکم صدقۃ۔ یعنی تمہارا اپنی بیویوں سے تمتع کرنا بھی صدقہ ہے۔ صحابہ کرام نے متعجب ہو کر پوچھا یا رسول اللہ انسان تو محض اپنی شہوت پوری کرتا ہے کیا اس میں بھی اجر اور نیکی ہے؟ آپ نے سمجھایا کہ انسان کا ہر فعل جو حدود شرعی کے اندر ہو باعث اجر ہے۔ اللہ کے قانون طبیعی کا منشا پورا کرنے میں اگر تم اپنے نفس کی شہوات کا اتباع کرتے ہو تو سزا کے مستحق ہو، اور اگر اللہ ہی کے قانون شرعی کا اتباع کرتے ہو تو اجر و ثواب کے مستحق ہو۔ جس طرح نماز عبادت ہے اسی طرح ایک خالص دنیوی معاملہ، حتیٰ کہ عورت اور مرد کی مقاربت بھی عبادت ہے۔ اگر مشروع طریقہ سے سرانجام دی گئی ہو، کیونکہ

یہ تمام چیزیں اسی ایک سلسلۂ حیات کی مختلف کڑیاں ہیں جس کا ایک سرا دنیا کے عام معاملات سے ملا ہوا ہے۔ اور دوسرا عبادات اور روحانیات سے۔ ان میں تفریق پیدا کرنا نظامِ اسلامی کو درہم برہم کر دینا ہے۔

اسلام کا نظریۂ خلافت جیسا شدید انقلابی نظریہ تھا، اس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ قرآن نے جب اس غیر مانوس نظریہ کا اعلان کیا تو دنیا نے کیسے اچنبھے کے ساتھ اسے سنا اور ماننے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ جس چیز کو نفسانی اغراض کی شکارگاہ سمجھتی تھی اسے اسلام نے ایک خالص اور پاک مذہبی فریضہ بنا دیا تھا۔ اس وقت تک استحقاقِ حکومت کے مختلف نظریے قائم تھے، مثلاً دنیا یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار تھی کہ جو جواں ہمت اپنی قوتِ بازو سے ایک سلطنت قائم کرتا ہے اس کی اولاد کو حق پہنچتا ہے کہ اسے اپنی وراثت سمجھ کر جس طرح چاہے اس سے متمتع ہو۔ وہ اس نظریہ کو بھی مانتی تھی کہ کسی قوم یا ملک پر حکومت کرنا صرف اسی قوم کا حق ہے۔ اس کی کتابِ سیاست میں یہ اصول بھی موجود تھا کہ جس گروہ نے سامانِ جنگ کی فراہمی میں مال واسباب کی قربانی دی ہو، جس نے اپنے خون کی آبیاری سے بادشاہی کا پربہار باغ تیار کیا ہو وہی اس بات کی مستحق ہے کہ اپنے خون کی قیمت سے اور اس پر

بہار باغ" کی بہار آفرینیوں کا مزہ اٹھائے یعنی جو سر معرکۂ کارزار میں کٹنے کے لئے گیا تھا. شاہانہ جلال کا تاج بھی اسی پر ہونا چاہئے. یہ اور ایسے ہی بے شمار اصول اس کی "کتاب سیاست" میں موجود تھے. ہاں اگر کوئی اصول نہ تھا. تو محض اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ کا اگر کوئی ناقابلِ قبول نظریہ تھا تو صرف یہ کہ قومیت، وطنیت وراثت وغیرہ کے تمام مطالبات ٹھکرا کر محض صالحیت، دیانت تقویٰ اور حزم و تدبیر کو استحقاقِ خلافت کا معیار قرار دیا جائے حکومت کے نظریوں اور اصولوں کو وضع کرنے میں نفس جاہلیت شہوت، پیٹ سبھی شریک تھے اگر کوئی چیز شریک نہ تھی تو محض عقل اور دیانت، نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نے جب ان نظریات کے مقابلہ میں خلافت کے ایک اچھوتے اور نامانوس تصوّر کو پیش کیا اور بتایا کہ یہ تختِ حکومت پھولوں کی سیج نہیں ہے جسکی طمع کی جائے. بلکہ کانٹوں کا بستر ہے جس پر راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے، جو اس تخت پر بٹھایا گیا گویا بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا! من وّلی القضاء فقد ذبح بغیر سکین حکومت کا یہ تاج عظمت و کبریائی کا تاج نہیں ہے بلکہ ذمہ داریوں کا ایک پہاڑ ہے جسکی گرانی سے مضبوط دماغ پاش پاش ہو جاتے ہیں، یہ خلیفۂ وقت قوم مخدوم اور مسجود نہیں ہے بلکہ اس کا خادم اور چاکر ہے تو اس کو

سن کر قوم پرستوں اور وطن پرستوں نے جو کچھ کیا اس سے تم واقف ہو چکے ہو لیکن یہ انقلابی تصورِ حکومت اس قدر عقلی اور جذبات نفس سے اس قدر بلند تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لیجانے کے بعد اسلام کے ان زبردست علمبرداروں نے بھی جو جاہلیت کے ایک ایک نشان کو پاؤں تلے روند چکے تھے، اس کو پوری طرح سمجھنے سے اپنے آپ کو عاجز پایا، حتیٰ کہ اگر ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے کامل مسلمان موجود نہ ہوتے تو صحابۂ کرام کی سی بہترین تربیت یافتہ جماعت بھی اس اعلیٰ و ارفع تصور حکومت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھی ہوتی۔ ثقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کا مسئلہ پیش ہوتا ہے۔ مہاجرین اور انصار میں جماعتی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ ایک گروہ اس خیال میں ہے کہ یہ سلطنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوت بازو سے قائم کی ہے، لہذا آپ کے قرابت داروں کے سوا وراثت اور جانشینی کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ دوسرا گروہ گردن موڑ کر عرب کے میدانوں اور صحراؤں کو دیکھتا ہے تو قریب قریب ہر جگہ اسے اپنے ہی نونہالوں اور جگر گوشوں کا مزار نظر آتا ہے، ہر سمت اسے اپنے ہی خون ہی لالی دکھائی پڑتی ہے اس وقت وہ اسلامی تصورِ صلاحیت و استحقاق سے بیگانہ ہو کر اپنی قربانیوں کا معاوضہ چاہتا ہے اور اپنے حق سے بڑھ کر کسی کے حق کو وزنی اور قابل اعتبار نہیں پاتا۔ دونوں گروہ اپنے اپنے نظریہ کے ماتحت سرگرم

بحث ہیں، اور چونکہ دلائل دونوں جانب ایک ہی سے ہیں اس لئے آخر کار
رفع نزاع کی خاطر انصار بول اٹھتے ہیں کہ منا امیر ومنکم امیر
یعنی ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم میں سے۔

اندازہ کرو اس قرآنی تصورِ خلافت کی بلندی کا! ایسے اربابِ
بصیرت اور اخلاص پسند انسانوں کی فہم بھی تھوڑی دیر کے لئے وہاں تک
پہنچنے سے قاصر رہجاتی ہے

مگر آسمانِ نبوت کے ماہ و پروین ابھی موجود تھے۔ ان کے طلوع
ہوتے ہی چند لمحوں میں حق کی روشنی چمک اٹھی، جاہلی وساوس کی گھٹا چھٹ کر
رہ گئی، اسلامی تصور حکم نکھر کر سامنے آگیا اور حق پرستوں کی جماعت نے
بالاتفاق اسکے آگے سر تسلیم خم کر دیا کہ وہ جس عالم میں بھٹک رہے تھے وہ غلط
فہمی کا دھند لکا تھا بلکہ نفس پرستی کا اندھیارا۔ نور علم آنے کے بعد جس شخص کو خلیفہ
منتخب کیا گیا وہ نہ اوسی تھا نہ خزرجی، نہ ہاشمی تھا یعنی یہ انتخاب نہ نسل کی سفارش
پر ہوا نہ وطن کی نہ وراثت کی اسکے انتخاب میں قربانیوں اور جان نثاریوں
کے معاوضہ کا بھی کوئی لحاظ نہ کیا گیا تھا۔ اس کو منتخب کیا گیا صرف اس لئے
کہ وہ نبی کے بعد افضل البشر تھا، سب سے زیادہ پرہیزگار تھا، سب سے بڑھکر مخلص اور بے
لوث تھا، سب سے بڑھ کر اسلام کی روح اور شریعت کے مزاج کو سمجھنے والا تھا
اور نبی کی تعلیم و تربیت سے فیض یاب ہونے میں سب پر فوق لے گیا تھا۔

اسلام کا نظریہ جنگ بھی ان شدید ترین انقلابی نظریات میں سے تھا۔ جسے گرفت میں لانا انتہا درجہ کا مجاہدہ نفس چاہتا تھا۔ تمام دواعیات نفس حتی کہ نفسانی غضب اور عداوت تک کے جذبات سے پاک کر کے اسلام نے جس طرح لڑائی کو خالصۃً ایک اجتماعی خدمت بنا دیا، اس کی اخلاقی رفعت کا اندازہ اس واقعہ سے کرو کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ایک دشمن کے سینے پر سوار ہو کر قتل کے لئے تلوار کو حرکت دے چکے ہیں۔ اتنے میں بے بس دشمن آپ کے منہ پر تھوک دیتا ہے۔ آپ فوراً ہاتھ روک لیتے ہیں اور اس کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ آپ فرماتے ہیں کہ میں اللہ کے لئے تجھے قتل کر رہا تھا جب تو نے مجھ پر تھوک دیا تو میرے نفس کا جذبۂ انتقام بھڑک اٹھا۔ اب اگر میں تجھے قتل کرتا تو میری نفسانیت بھی اس فعل میں شریک ہو جاتی۔ اس تصور کی خالص اخلاقیت اور بے لوث عقلیت اتنی بلند تھی کہ اسکی رفعتوں تک پہنچنے میں ان لوگوں کو بھی ابتداءً بڑی دشواریاں پیش آئیں جو نفسانیت اور جاہلیت کو یکسر خیرباد کہہ چکے تھے برسوں کی تعلیم و تربیت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو میدان جنگ میں لائے، اور باوجودیکہ ان کی ذہنیت میں انقلاب عظیم رونما ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی اسلام کی ابتدائی لڑائیوں میں صحابۂ کرام جہاد فی سبیل اللہ

کی اصلی اسپرٹ کو سمجھنے میں بار بار غلطیاں کر جاتے تھے جن کی وجہ سے بعض غزوات میں اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین سے شکست بھی کھلوا دی۔ تاکہ وہ اپنی لغزشوں پر متنبہ ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، اس میں صدیوں کی روایات سے یہ تصوّر گہری جڑوں کے ساتھ جما ہوا تھا کہ لڑائی یا تو مال وزر اور ملک و سلطنت کے لئے ہوتی ہے، یا پھر جذبۂ عداوت وانتقام کے لئے اس تصور کو دل و دماغ کے ایک ایک ریشے سے نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا چنانچہ غزوات اسلام کی تاریخ پر غائر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار رسالت مآب کو جنگ کے متعلق صحابہ کا نقطۂ نظر درست کرنے میں کتنی محنت کرنی پڑی ہے۔

سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلعم سے پوچھا "یا رسول اللہ اس مجاہد کے متعلق کیا ارشاد ہے جو مال غنیمت کی طلب اپنے دل میں رکھتا ہے"۔ آپ نے فرمایا، اس کو آخرت میں کوئی اجر نہ ملیگا" جب ان صحابی نے لوگوں تک یہ ارشاد پہنچایا تو وہ بے حد متعجب ہوئے انہیں یقین نہ آیا کہ حضور نے ایسا فرمایا ہوگا۔ اور بیان کرنے والے کی سماعت کی تکذیب کرنے لگے۔ دوبارہ بھیجا کہ تم نے مطلب نہ سمجھا ہوگا جاکر از سر نو تحقیق کر آؤ۔ وہ جب دوبارہ اسی جواب کو لے کر لوٹے تو بھی لوگوں کا استعجاب کم

نہ ہوا، جس چیز کو وہ بہترین ذریعہ معاش اور اعلیٰ ترین مقصد جنگ سمجھتے آئے تھے اس کے متعلق یہ فیصلہ ایسا عجیب بلکہ بداہت کے خلاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کی عقلیں بار بار اسے تسلیم کرنے سے ابا کرتی تھیں۔ آخر کار تیسری بار دریافت کرنے پر انہیں یقین آیا اور معلوم ہوا کہ اسلام کا تصور جنگ، رغبات دنیوی اور جذبات نفس سے اسقدر پاک اور منزہ ہے یہاں کا سودا (مادی لحاظ سے) ایک طرف ہے۔ محض سر دینا ہے خون بہا لینا نہیں ہے۔ مال خرچ کرنا ہے مال حاصل کرنا نہیں ہے یہاں شرط یہ ہے کہ حریف کی دشمنی تمہیں میدان میں نہ لے جائے بلکہ اس کی اور سارے عالم کائنات کی ہمدردی کے لئے جاؤ۔ تاکہ جہلا اپنی نادانی کی بنا پر مرکز عدل کو ہٹا کر میزان قسط کو پامال کر کے اور خدا کی زمین میں شر و فساد برپا کر کے اپنے اوپر ظلم کرنے اور اپنی دنیا و آخرت برباد کرنے سے باز آجائیں، یعنی دراصل تم ظالموں کی مدد کرتے ہو نہ کہ مخاصمت اور دشمنی۔ عرصہ کارزار دنیا کمانے کی جگہ نہیں ہے۔ ایک مقدس ترین عبادت کی جگہ ہے جہاں لوگ قتل نہیں کئے جاتے، انسانیت زندہ کیجاتی ہے۔

جہاد کی اسی حقیقت کو جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمایا "اپنے بھائی کی مدد کرو وہ ظالم ہو یا مظلوم" تو صحابہ کرام کی حقیقت شناس نگاہیں بھی اس رمز کو نہ پاسکیں اور انہوں نے متعجب ہو کر

پوچھا "مظلوم کی اعانت تو ہو سکتی ہے مگر ظالم کی اعانت کیونکر ممکن ہے؟"
آپ نے فرمایا "ظالم کی اعانت یہ ہے کہ اسے ظلم سے روک دو"۔

ایک موقع پر جب شارع علیہ السلام نے اسی تصویر کے دوسرے رُخ کو پیش کیا اور فرمایا۔

اِذَا الْتَقَی الْمُسْلِمَانِ بِسَیْفِہِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ کِلَاھُمَا فِی النَّارِ "جب دو مسلمان تلواریں لے کر آپس میں لڑ پڑیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہونگے"۔ تو جس طرح تصویر کے پہلے رُخ نے حیرت میں ڈال دیا تھا یہ دوسرا رخ بھی بالکل نرالا اور تعجب خیز معلوم ہوا، صحابہ کرام نے متحیر ہو کر پوچھا:

هٰذَا الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ الْمَقْتُوْلِ؟ (ایک تو خیر قاتل تھا اور قتل کرنے کی پاداش میں جہنمی ہوا) لیکن مقتول کی کیا خطا ہے؟

جواب ملا:

"اِنَّهٗ کَانَ حَرِیْصًا عَلٰی قَتْلِ صَاحِبِهٖ" (اس کی وجہ یہ ہے کہ) وہ بھی اپنے مقابل کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ یعنی صرف اتنا ہی نہ دیکھو کہ وہ مقتول اور مظلوم ہے۔ بلکہ یہ بھی دیکھو کہ کس چیز نے اس سے تلوار اٹھوائی تھی؟ کیا محض اسکی ذاتی منافرت اور جاہلی حمیّت کی تحریک نہ تھی؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اسلام کی نگاہ میں کسی نفسانی غرض اور حمیت کے ماتحت

تلوار اٹھانا کس قدر مبغوض ہے؟ خصوصاً جس قطرۂ خون کو اسلام کی حرمت حاصل ہے اسے بغیر کسی حق کے بہانا یا بہانے کی نیت کرنا بدترین معصیت ہے حتیٰ کہ اگر تمہاری تلوار کسی دشمن کافر پر کھینچ چکی ہو اور وہ لا الٰہ الا اللہ پڑھ دے تو پھر تمہیں اپنی تلوار کو ایک انچ بھی آگے بڑھانے کا مجاز نہیں کہ اب وہاں سے جاہلیت کی حد شروع ہو جاتی ہے۔

چنانچہ حضرت خالدؓ کو یہی مشکل پیش آئی تھی۔ انہوں نے دوران جنگ میں ایک دشمن پر وار کیا۔ اس نے فوراً کلمۂ طیبہ پڑھ دیا۔ مگر آپ نے ہاتھ روکا نہیں اور اس کا کام تمام کر دیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اصل واقعہ کی جب خبر ہوئی تو آپ نے باز پرس کی۔ حضرت خالد نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نے محض موت کے ڈر سے ایسا کیا تھا۔ پھر اس سے محاربانہ سلوک کرنے میں کیا زحمت تھی؟ آپ نے فرمایا کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟ تمہیں کیا معلوم کہ جو اس کی زبان سے نکلا اس کے دل میں نہ تھا۔ اگر وہ ایمان لا چکا تھا تو پھر تم نے کس حق کی بنا پر اس کا خون بہانا روا رکھا؟

گویا یہ ایک ذرا سا وہم بھی اسلامی جنگ کے رخ کو پھیر دیتا ہے اور اسلام کی غازیانہ ذہنیت کسی خفیف سے خفیف غیر اسلامی جذبہ کی شرکت بھی گوارا نہیں کر سکتی اور اس معاملہ میں اسقدر نفس کے میلانات سے متنفر ہے

کہ حضرت خالدؓ جیسے صاحب فہم انسان کو بھی اس کے حدود کی تمیز مشکل ہو گئی

اسلامی مساوات کا نظری پہلو اس قدر واضح تھا کہ صحابۂ کرام نے نہایت آسانی سے اسے قبول کر کے اپنے طریقہ معاشرت کو اس کے سانچے میں ڈھال دیا، اور جبکہ دنیا نے سیادت و حکومت حسب نسب اور مال و زر کے صدہا امتیازات قائم کر رکھے تھے انہوں نے پردیسیوں کو امامت دی، غلاموں کو سپہ سالاری بخشی، ان کی شتربانی کی اور فخر نسب اور غرور مال کے سارے بتوں کو توڑ کر شرف و مجد کا معیار صرف تقویٰ اور طہارت پر رکھا تاہم بعض حضرات کبھی کبھی قدیم تصورات کے استیلا پر اس نظریہ کو فراموش بھی کر بیٹھتے تھے۔ اور آنحضرت اس پر سخت تنبیہہ فرماتے تھے۔ ایک بار حضرت ابوذر غفاری نے جوش غضب میں اپنے غلام کو ناروا کلمات کہدئے۔ رحمۃ اللعالمین نے سنا تو برافروختہ ہو کر فرمایا۔ اِنَّكَ اِمْرُءٌ فِيكَ جَاهِلِيَّة" ابوذر! تمہارے اندر ابھی تک جاہلیت کا فاسد مادہ موجود ہے!

ایک بڑے خاندان کی عورت نے چوری کی، بارگاہ رسالت نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ کاٹ لئے جائیں۔ خاندانی عظمت کا سویا ہوا تصور دماغوں میں جاگ اٹھا۔ لوگوں نے حضرت زید سے سفارش کرائی کہ ایک صاحب حسب عورت کی یہ توہین نہ کی جائے۔ چہرہ مبارک فرط غیظ سے متغیر ہو گیا اور آپنے نہایت غضبناک لہجہ میں فرمایا "کیا تم مجھ سے حُدود اللہ کے

بارے میں سفارش کرتے ہو؟ اسی چیز نے پچھلی قوموں کو ہلاک کیا۔ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی غریب و بیکس اسی جرم کا ارتکاب کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی چوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ کٹوا دونگا۔"

حضرت قدامہؓ بن مظعون ایک جلیل القدر صحابی اور حضرت عمرؓ کے سالے تھے۔ انہوں نے شراب پی اور خود فاروق اعظم نے قرابت اور جلالت شان کا کوئی لحاظ کئے بغیر ان پر حد جاری کرنی چاہی تو لوگوں میں پھر وہی امتیاز نسلی کا غیر اسلامی تصوّر آموجود ہوا، اور حضرت عمر کی مخالفت ہونے لگی۔ لیکن وہ امرِ حق میں تیغ دو دم تھے۔ انہوں نے فوراً اس وسوسہ جاہلی کو دلوں سے نکالتے ہوئے فرمایا "مجھے ان کا کوڑوں کے نیچے مرجانا منظور ہے مگر خدا کے حضور میں حدودِ الٰہی کے توڑنے کا بار لیکر جانا گوارا نہیں، جلد ایک مضبوط کوڑا لے آؤ۔"

ایک دن سردارانِ قریش میں سے حضرت ابوسفیانؓ ابن حرب اور حضرت حارث بن ہشام وغیرہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مگر وہاں سب سے پہلے اہل بدر کو جن میں حضرت صہیبؓ رومی حضرت بلال حبشی اور حضرت عمار بھی تھے شرفِ باریابی بخشا گیا۔ حضرت ابوسفیان جنہوں نے ابھی کل تک بڑے بڑے جبابرۂ مکہ کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکتے

دیکھا تھا، اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکے۔ ان کے اپنے رئیسانہ افتخار کی یہ پامالی دیکھی نہ گئی۔ انہوں نے نہایت چیں بجبیں ہو کر فرمایا کیا قیامت ہے؛ ان ناچیز غلاموں کو اذن ملتا ہے اور ہم بیٹھے منہ تکتے ہیں ہمارے مراتب کی یہ تحقیر! ان کا دماغ اس وقت اسلامی تصورِ فضل و کرامت کی اونچائیوں سے بہت نیچے اتر آیا تھا۔ وہ بھول بیٹھے تھے کہ یہ اسلام کا دربار ہے۔ یہاں عزت و عظمت کے نظریات جاہ دنیوی اور علو نسبی سے نہیں اخذ کئے جاتے۔ یہاں انسانی فضل و کمال طاعت الٰہی کی میزان میں تولا جاتا ہے رنگ و نسل کے پلڑوں میں نہیں۔ آخر کار حضرت سہیل ابن عمرو نے جو ساتھ باہر کھڑے تھے سمجھایا کہ یہ موقع حسرت کا ہے غضب کا نہیں اسلام نے سب کے ساتھ تمہیں بھی اس نعمت کی طرف بلایا تھا، مگر تمہاری بدبختی نے تمہیں پیچھے ڈال دیا اور یہ لوگ آگے بڑھ گئے۔

اسلامی مساوات کا ایک پہلو انزلوا الناس علیٰ منازلھم (یعنی لوگوں کو ان کی حیثیت کے مطابق جگہ دو) کا بھی ہے۔ کیونکہ اسلام کے قوانین اور نظریات میں افراط تفریط نہیں سراسر عدل اور میانہ روی ہے۔ یہ پہلو ذرا زیادہ غامض تھا۔ جس تک دور رس صحابہ ہی کی نگاہیں پہنچتی تھیں۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق حضرت عائشہ نے ایک فقیر کو روٹی کا ایک ٹکڑا دے کر رخصت کر دیا، لیکن تھوڑی دیر بعد ایک مہذب

اور خوش پوشاک انسان آیا تو اسے بٹھا کر نہایت عزت و احترام سے کھانا کھلایا۔ لوگوں کو بظاہر اس تفریق پر استعجاب ہوا تو حضرت عائشہ صدیقہ نے مذکورہ بالا فرمانِ رسالت سنا دیا۔ اس وقت ان کی سمجھ میں آیا کہ حدود اور قوانین ملکی جیسی مساوات عام آدابِ معاشرت میں قائم کرنا حکمت اور دُور اندیشی کے خلاف ہے ہر انسان کے منتہائے نظر اور دماغی پرواز کے مطابق اس سے سلوک کرنا چاہئے۔

اسلام نے اپنی ہیئت اجتماعیہ کی بنا رنگ و نسل اور ملک و وطن کے بجائے محض افکار اور عقائد کی یکسانی و ہم آہنگی پر رکھی تھی۔ اس نے بھائی سے بھائی پر تلوار اٹھوائی۔ اس لئے کہ ایک حزب اللہ کا رکن تھا۔ لیکن دوسرا اس کا باغی تھا۔ اس نے قریشی کو حبشی سے گلے ملایا۔ اس لئے کہ دونوں کا تصور حیات اور نظام زندگی ایک تھا۔ اس نے مکہ والوں کو لا کر اوس اور خزرج کا ہم قوم قرار دیا اور خود مکیوں اور یثربیوں کے اپنے اعزہ و اقارب کو غیر ٹھیرا دیا، اس لئے کہ مسلمانوں اور ان کے کافر عزیزوں میں اگرچہ خون کا رشتہ تھا۔ وطن کا رشتہ تھا۔ نسل کا رشتہ تھا، مگر لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کا وہ اصلی اور لازوال رشتہ روحانی نہ تھا۔ جس پر یہ سارے مادی اور خود غرضانہ رشتے قربان ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کی تاریخ میں جو انقلاب سب سے بڑا، سب سے عظیم الشان اور سب سے زیادہ محیر العقول کہا جا سکتا

ہے وہ یہی اسلامی قومیت اور نظم اجتماعی کا انقلاب تھا، جس نے نسل، رنگ، زبان، اور جغرافیہ کی منقراضوں سے کٹی ہوئی انسانیت کو ربط و تعلق کی ایک ایسی عقلی بنیاد فراہم کر دی جس پر تمام نوع انسانی متحد ہو سکتی ہے، جس نے پہاڑوں اور دریاؤں کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ انسان کو انسان سے کاٹ دیں، جس نے کھال کے رنگ، اور نطفہ کے خصائص، اور زبان کی چال ڈھال کو بھی یہ اقتدار دینے سے انکار کر دیا کہ وہ انسان اور انسان کے درمیان حائل ہو جائیں۔ اس نے جاہلیت کے تمام شیرازوں کو توڑ کر صرف ایک شیرازہ ایمان کو قومیت کی اساس اور علت جامعہ قرار دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاجرین اور انصار، جن کا قومی آن اور وطنی تعصب پر مر مٹنا اولین مقصد زندگی تھا، باہم حقیقی بھائیوں کی طرح گھل مل گئے۔

جس وقت اسلام یہ انقلاب برپا کر رہا تھا، جاہلیت بھی اس وقت خاموش نہ تھی۔ اس نے ہاتھوں سے نکلتے ہوئے میدان کو دانتوں سے پکڑنے کی کوشش کی، اور قدم قدم پر انقلاب اسلامی کے سیلاب کا مقابلہ کیا۔ ایک طرف اسلام نسل آدم کے بکھرے ہوئے اجزا کو دین اور تہذیب کے رشتے میں جوڑ رہا تھا، اور دوسری طرف جاہلیت اپنی انہی پرانی منقراضوں سے اس پر حملہ کرنے کیلئے مستعد تھی۔ صحابۂ کرام ایک مدت تک اس کشمکش

میں مبتلا رہے بارہا ایسا ہوا کہ منافقین کی مفسدہ پردازیوں اور خفیہ ریشہ دوانیوں نے عصبیت کے غیر اسلامی جذبات کو بھڑکا دیا اور فتنۂ وطنی و نسلی تعصب برقی رو کی طرح جسم کے رگ و ریشہ میں دوڑ گیا۔ غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر ایک مہاجر نے کسی انصاری کو تھپڑ مار دیا۔ اس نے اپنا قومی نعرہ لگایا۔ چشم زدن میں طرفین سے تلواریں کھینچ گئیں اور تھوڑی دیر کے لئے اسلامی مواخات اور تصوّر قومیت سے دل و دماغ بغاوت کر بیٹھے۔ ایک مرتبہ اوس و خزرج دونوں قبیلوں کے بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے باہم گفتگو کر رہے تھے۔ یہودی شر انگیزوں کا ایک گروہ پہنچا کہ کسی طرح جاہلی تصورات کو ابھار کر ان دونوں قبیلوں کی پرانی عداوتوں کو تازہ کر دیا جائے کیونکہ انہیں کے اتحاد پر اسلامی شوکت اور قوت کا دار و مدار تھا۔ چنانچہ جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا، جس میں یہ دونوں قبیلے لڑ کر قریب قریب فنا ہو گئے تھے۔ عصبیت کی دبی ہوئی چنگاریاں شعلہ بن کر بھڑک اٹھیں۔ اور قریب تھا کہ انقلاب معکوس (Counten Revolutnoe) برپا ہو جاتا۔ لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم آ موجود ہوئے اور وعظ و تذکیر کے ذریعے اس فتنہ کو بجھا دیا۔

واقعۂ افک کے سلسلے میں جب آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ کون ہے جو اس مفتری سے ہمارا انتقام لے جس نے مجھے ایسی ایذا دی ہے؟ حضرت

سعدؓ بن معاذ نے اٹھکر فرمایا کہ میں حاضر ہوں اگر وہ مفتری میرے قبیلہ (اوس) کا ہے تو بتلایئے میں اسکی گردن مار دوں، اگر خزرجی ہے تو بھی آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔ انہوں نے اسے اپنی قومی عزت اور شان پر حملہ خیال کیا، قبائلی عصبیت نے جوش مارا اور اسلامی تصوّر قومیت پر چھا گئی انہوں نے فوراً بھڑک کر کہا کہ خزرج کے آدمی کو مارنے والے تم کون ہوتے ہو؟ بات بڑھی اور اگر سرکار رسالت مآب موجود نہ ہوتے تو شاید اسلامی قومیت اور اخوت کی لاش اسی وقت خون کے دھارے میں تیرتی نظر آتی۔

اس قسم کے بکثرت واقعات اس انقلاب کی ابتدائی تاریخ میں ملتے ہیں جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام و جاہلیت کے اس معرکہ میں صحابہ کرام کی سی خالص و مخلص جماعت کو بھی کیسی سخت زحمتوں سے دوچار ہونا پڑا اور کس قدر سخت جد و جہد کے بعد نبی اکرم نے وہ انقلابی سوسائٹی بنائی جس کی رگ رگ سے جاہلیت نکال دی گئی تھی۔

انسان کے ذاتی جذبات قومی اور خاندانی جذبات سے کہیں زیادہ عزیمت شکن اور بے پناہ ہوتے ہیں۔ جب غیرت اور حمیت کا طوفان جوش مارتا ہے تو بڑے سے بڑے ارباب عزم و متانت کے پاؤں بھی اسکی رو میں اکھڑ جاتے ہیں نفس کا یہ سب سے کامیاب اور خطرناک وار ہے جسے رد کرنے

کے لیے نبوت کا استقلال چاہیے۔ اسلام کی بلند نظری اور حق پسندی یہاں اپنے انتہائی کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ اگرچہ غیرت انسانیت کا ایک بہترین جوہر ہے لیکن اسلام اسے بھی آزاد نہیں چھوڑتا، اسے بھی اپنا تابع بناتا ہے، اسے اعتدال کے حدود سے باہر نہیں جانے دیتا، اور انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ کبھی نفس کے رجحانات سے مغلوب نہ ہو۔ جو کچھ کرے اور جو کچھ کہے نفسانیت اور جذبات سے عاری ہو کر، محض خدا کے لیے اس کی رضا جوئی کے لیے اور اس کے نظام عدل کی برقراری کے لیے۔ اسلام کا یہ نازک ترین مطالبہ ہے، اور یہ اتنا نازک ہے کہ ایک مرتبہ صدیق اکبر جیسا بے نفس، متورع اور سراپا للہیت انسان بھی اس کو پورا کرنے سے چوک گیا۔ واقعہ افک ایسا شدید سانحہ تھا جس سے بڑھ کر انسان کے لیے جانگسل اور روح فرسا ابتلا ممکن ہی نہیں جب باپ کی عفت مآب بیٹی پر جھوٹا الزام لگے اس کی جراحت دل کا حال کسی باپ ہی سے پوچھو۔ یہی زخم صدیق اکبر کے دل پر لگا تھا۔ اس زخم پر نمک چھڑکنے والوں میں ایک صاحب مسطح بن اثاثہ بھی ناسمجھی سے شریک ہو گئے تھے جو نہ صرف حضرت صدیقؓ کے قریبی رشتہ دار تھے، بلکہ آپ کے پروردہ بھی تھے۔ صدیق اکبرؓ کا اس پر رنجیدہ ہونا بشریت کا طبعی اقتضا تھا، چنانچہ آپ نے قسم کھالی کہ آئندہ سے اس شخص کی کفالت نہ کروں گا۔ مگر اسلام ایک سچے انسان کو جس

مقام فضل و احسان پر دیکھا جا رہا ہے یہ مقام غیظ و انتقام اس سے فروتر تھا فوراً تنبیہہ ہوئی کہ:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (نور - ۳)

تم میں سے بڑے اور صاحب مقدرت لوگ قرابت داروں مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو مدد دینے کی قسم نہ کھائیں اور چاہئے کہ انہیں معاف کر دیں اور ان سے درگذر کریں کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں بخشدے اور اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

غور کرو مسطح نے کیسا شنیع جرم کیا تھا؟ اپنے محسن اور سرپرست کے کلیجے پر کیسا سخت تیر مارا تھا؟ اور اس کی بادأش میں اس پیکر صبر و تحمل نے کتنا خفیف اقدام کیا تھا؟ مگر اسلام کی رُوح اس خفیف ترین بیگانے جذبہ سے بھی کس طرح مضطرب ہو جاتی ہے؟ اس کا معیار فضیلت اتنی سی غیر اسلامی حمیت کو بھی برداشت نہیں کرتا۔

لڑائی کا میدان انسانیت کا مذبح مانا جاتا ہے لیکن اسلام کا میدان جہاد حیاتِ انسانیت کا سرچشمہ ہے شہید ہونے والا مرنے کے بجائے زندہ ہوتا اور بہتوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ دنیا کے خیال میں

ثانیاں اسبابِ معیشت کی بربادی اور نسلِ انسانی کی ہلاکت ہیں۔ لیکن اسلام
کہتا ہے کہ جہاد میں خرچ کرنے سے گریز کرنا ہی اصل ہلاکت اور نامرادی
ہے۔ یہاں تم جتنا زیادہ خرچ کروگے اس سے زیادہ رزاقِ عالم تمہیں دیگا
خدا نے تم پر اپنا کلمہ بلند کرنے کی ذمہ داری عائد کی ہے، اور رزق بھی اسی کا
دیا ہوا ہے۔ لہٰذا اس کے عطا کردہ رزق کو اسی کی راہ میں صرف کرنے سے جی
چرانا کفرانِ نعمت ہے۔ یہ انسان کی نادانی اور دنیا پرستی ہے کہ وہ انفاق
فی سبیل اللہ کو مال و اسباب کی اضاعت سمجھتا ہے۔

بعض انصار کو یہی غلط فہمی پیش آئی تھی جب اسلام خوف و ہراس کی
چار دیواریوں سے نکل کر عزت اور توانائی کے کھلے میدان میں آکھڑا ہوا۔ اور
اعوان و انصار کی کثرت ہوگئی تو بعض لوگوں نے کہا اب اسلام کا دائرہ اقتدار
مدینہ سے باہر تک وسیع ہو چکا ہے۔ حواریوں کی اب کمی نہیں رہی۔ اس لئے
ہمیں اپنی جائداد کی اصلاح و توسیع کی فکر کرنی چاہئے کیونکہ مسلسل غزوات نے
ہمارا معاشی نظام پارہ پارہ کر ڈالا ہے، مال کی قربانی دیتے دیتے ہم چور چور ہوگئے
ہیں، اور ہلاکت و ناداری کے کنارے آگئے ہیں۔ پروردگارِ عالم نے اس غیر
اسلامی وہم کی فوراً تردید کی اور فرمایا:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ	اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اور انفاق
اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ	سے الگ رہ کر، اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اِلَی التَّھْلُکَۃِ۔ (یعنی انفاق فی سبیل اللہ ہلاکت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے رک جانا اور معاش کی فکر میں لگ جانا اصل ہلاکت اور خسران ہے)۔

اس تفصیل سے یہ اندازہ کرنا مقصود تھا کہ اسلام کا تصور حیات، اس کا نظریۂ مذہب، اس کے اصول اخلاق، اس کے مناہج تمدن و سیاست اور اس کے مقاصد صلح و جنگ کیسے انقلابی تھے، اور نفسانیت، روایتی افکار اور موروثی رسوم و رواج سے الگ کر کے ان کی بنا کیسی خالص عقلیت پر رکھی گئی تھی کہ نہ صرف جاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹکنے والوں نے اس سے وحشت اور بیگانگی محسوس کی، بلکہ جن کی عقل اور فطرت سے یہ تاریکیاں چھٹ چکی تھیں اور جن میں فہم و بصیرت کا نور چمک اٹھا تھا۔ انہیں بھی ان بلندیوں کے سامنے بار بار حیرت سے ٹھٹک جانا پڑا۔ اور ان کے ہادی (علیہ السلام) نے کتنی مشکلوں کے بعد اس بلندی پر پہنچا کر انہیں اس "غریب" اسلام سے مانوس کیا۔

جاہلیت کی شکست

تیئس سالہ عہد رسالت کی مسلسل جدوجہد کے بعد جاہلیت سرنگوں ہو گئی۔ میدان فکر و عمل کے ایک ایک گوشہ سے اس کے قدم اکھڑ گئے۔ روح انسانی آزاد اور نفس حیوانی مغلوب و مقہور ہو کر رہ گیا۔ جو کبھی جاہلیت کے سپاہی تھے وہ پرچم اسلامی

کے نیچے آگرے ہوئے اور انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے آہنی قلعوں کو زیروزبر کر کے رکھ دیا۔ یہ اسلام یا عقل و فطرت کی اس کامل فیروزمندی اور عظیم الشان کامیابی کا وقت تھا جس کی مثال آپ تاریخ انسانی کے صفحہ پر نہیں پا سکتے اور کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل آپ کی اس آرزو کو پورا کرنے میں کامیاب ہوگا۔

دراصل پیغمبر آخرالزمان کی بعثت کا مقصد وحید بھی صرف یہی تھا کہ انسانی فطرت کو جاہلیت کی چیرہ دستیوں سے آزاد کرا دیں اور باطل کی دسیسہ کاریوں نے حقانیت کا جو تلفریب نقاب اوڑھ رکھا ہے اسے ہٹا کر سچائی کا حقیقی جمال نگاہوں کو دکھا دیں۔ اسی بنا پر قرآن حکیم کو "تذکرہ" کہا گیا ہے کہ یہ غفلت و خود فراموشی کی مدہوشیوں سے بیدار کر کے انسان کو اس کے بھولے ہوئے فرائض یاد دلاتا ہے، "کتاب مبین و نور مبین" کہا گیا ہے۔ کہ یہ جہل کی تاریکیوں میں گم ہو جانے والے آثار ہدایت کو ظاہر کرتا ہے "فرقان" کہا گیا ہے کہ یہ حق و باطل کی سرحدوں کو الگ کرتا ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ کو پچھلی تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے، قرآن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود ابتداءً انسان کے لئے ایک انوکھی اور ناقابل فہم و قبول چیز تھا جس کی وجہ انسان کی محض ارادی شرارت ہی نہ تھی، بلکہ بڑی حد تک اس کی بیچارگی بھی تھی۔ اس کی بدبختی میں اس کے فساد مذاق سے بڑھ کر ماحول کی زبردست

قوت، مادی رسوم و افکار کی دماغوں پر مسلسل حکمرانی جاہلیت کی ظاہری سر بلندی اور اسلام کی مظلومی کا دخل تھا۔ اسی بنا پر قرآن اور صاحب قرآن نے عقل و فطرت کی صیقل گری میں پیہم ۲۲ سال گذار دیئے، اور افہام و تفہیم کے لئے جو طریقہ بھی مؤثر ہو سکتا تھا اختیار کیا۔ آخر میں اس نے کہدیا کہ اب تمہارے لئے عذر کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ اللہ کی حجت پوری ہو چکی حق پوری طرح واضح ہو چکا، اب صرف تمہاری استعداد فطرت پر سارا معاملہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ	دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں،
تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ الخ	ہدایت، ضلالت سے متمیز ہو چکی۔

یعنی اسلامی تعلیمات سے مانوس ہونے میں جتنے موانع تھے سب کی حقیقت کھول دی گئی ہے اور انوار حق پر جاہلیت و وہم پرستی کے جتنے سیاہ بادل چھا گئے تھے وہ اب چھٹ چکے ہیں حسن فطرت نکھر کر مشہود ہو چکا ہے جس کا جی چاہے اس کے حلقہ کی اسیری قبول کرے، جس کا جی چاہے انکار کر دے۔ ردّ و قبول کا انحصار ذوق نظر پر ہے، جبر و اکراہ پر نہیں۔ قرآن کی مخاطب عقل ہے جسم نہیں اس نے اپنا فرض ادا کر دیا اور وادی شک و اضطراب میں بھٹکنے والی عقلوں کے سامنے جنہیں جاہلیت کی پھیلی ہوئی تاریکیوں میں سرگشتگی و حیرانی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا، "رشد" کی نورانی تصویر

پیش کر دی جن دلوں میں قبولِ حق کی صلاحیت موجود ہو گی وہ ان کھوئی ہوئی باتوں کو اپنی متاعِ گم گشتہ سمجھ کر لیں گے اور جو اپنی صلاحیتوں کو فنا کر چکے ہیں جنکی طبیعتوں پر رنگ چڑھ چکا ہے جو رسم کے بندے اور محسوسات کے غلام ہو چکے ہیں ضد و شقاق جن کا شیوہ اور آباء پرستی و جہل پرستی جن کا ایمان ہو چکا ہے جو انسانیت کے جوہر انسانیت سے محروم ہو کر بَلْ هُمْ اَضَلُّ کی لعنتوں میں محصور ہو چکے ہیں ان کے لئے بھی "غَیّ" و ضلالت کی شاہراہ ممیز کر کے دکھا دی گئی ہے وہ اگر اس پر چلنا چاہیں تو خوشی سے چل سکتے ہیں لیکن ہیں دونوں راہیں الگ الگ اشتباہ اور التباس کے سارے پردے اٹھا کر قرآن نے دونوں کے درمیان ایک واضح خط امتیاز کھینچ دیا ہے۔ لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔

"قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" دراصل اعلان تھا مقصد رسالت کی تکمیل کا رسول اللہ صلعم کا کام صرف اتنا ہی تھا کہ جاہلیت کی اس عالمگیر گرفت سے حساس اور مستعد دلوں کو آزاد کر کے ان میں اسلام کی روشنی بھر دیں اور آہستہ آہستہ جاہلیت کے سارے اثرات مٹا کر اسلام کا بلند و برتر نظام زندگی اور اس کا خاص عقلی تصور حیات ان کے دل و دماغ پر نقش کر دیں تاکہ وہ جو کچھ دیکھیں اسلام کی نگاہ

سے، جو کچھ سوچیں اسلام کے دماغ سے، جو کچھ کریں اسلام کے ہاتھ سے وہ اسلام کے سرفروش علمبردار ہوں حقیقی معنوں میں خلیفۃ اللہ فی الارض ہوں، اپنی فکری و عملی قوتوں سے جہالت زدہ ذہنیتوں کا نقشہ الٹ کر رکھ دیں، اور رفتار زمانہ کا رخ پھیر کر اس کی زمام نفس کے ہاتھوں سے لیکر عقل و انسانیت کے ہاتھوں میں دے دیں۔ جب یہ کام ۲۳ سال کی ان تھک کوششوں کے بعد سرانجام پاگیا تو اللہ رب العزت کا پیام آیا:

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَ اسۡتَغۡفِرۡهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا

جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے، اور تو دیکھے کہ لوگ اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اسکی پاکی بیان کر، اور اس سے مغفرت طلب کر، بیشک وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

گویا رسول اللہ صلعم کی دنیوی زندگی کا اختتام اسی لمحہ کا منتظر تھا اور جب وہ وقت آگیا کہ نصرت الٰہی نے جاہلیت کے سارے قلعے منہدم کرکے اسلام کی شوکت کو بلند اور اس کی صداقت کو بے حجاب کر دیا، اور نتیجہ کے طور پر اسکی بلند تعلیمات سے بہرہ ور ہو سکنے والے انسان دوڑ دوڑ کر اس

ہم آغوش ہونے لگے تو اب ہادی کی ضرورت نہ رہی اور اشارہ غیبی بلا واسطے کارگر ہو گیا۔

اس کے بعد وہ جماعت جو درسگاہ نبوت میں تربیت پاکر اسلامی نظریات کے سانچے میں ڈھل چکی ہے نظام اسلامی کو قائم کرکے آگے بڑھتی ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار ہے۔ اقامتہ عدل اور اعلائے کلمۃ اللہ کا مقدس جذبہ اس کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ روم و ایران کی طاغوتی ملوکیتوں کو زیر و زبر کرکے محض اپنا سیاسی اقتدار جمانے ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ ساتھ ہی ساتھ ان جاہلی نظریات اور افکار کو بھی الٹتی جاتی ہے۔ جن کے زیر سایہ عالم انسانی کا پورا نظام تہ و بالا ہو رہا تھا۔ اس نے جس قدر زمین کی منقولوں اور تاج و تخت کی عزتوں کو فتح کیا اس سے بہت زیادہ انسانی افکار و عواطف اور عام نظریات و تصورات پر اپنی عالمگیر حکمرانی قائم کی مسلمانوں کی تلوار ابھی قسطنطنیہ ہی میں سرگرم پیکار تھی لیکن قرآن کی شعاعیں فاتحانہ وسط یورپ تک پہنچ چکی تھیں۔ فاتح مجاہدین نے جو کہ خود قرآنی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، جن جن قوموں کو فتح کیا انہیں بھی اسی رنگ میں رنگ لیا۔ ان کے سواد اعظم کو قرآنی نظریات و افکار میں جذب کر لیا۔ اور اپنی علمی و عملی قوتوں کے ذریعہ ان کی ذہنیتوں میں ایسا انقلاب پیدا

پیدا کر دیا کہ وہ خود اسلامی فکر اور قرآنی تہذیب کی علمبردار بن گئیں ان میں سے جو نظریاً حق پرست اور راست کیش تھے انہوں نے اس پورے نظام ہی کو قبول کر لیا اور جن کی عقل اور فطرت حمیت جاہلیت کی بندشوں میں سخت جکڑی ہوئی تھی اگرچہ وہ اپنی زبان کو تو لا اِلٰہ اِلّا اللہ کہنے سے بچا رہ گئے لیکن اسلامی فکر و نظر کا اثر قبول کرنے سے وہ بھی اپنے دامنوں کو نہ روک سکے کیونکہ یہ ان کے بس میں نہ تھا۔ اسلام کا سیلاب اپنی مادی اور روحانی دونوں قوتوں سے نہایت ہی بے پناہی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اور ہر اس . . . فکر و عمل کے لئے جس کی بنیاد نفسانیت اور جاہلیت پر رکھی گئی تھی اس کی رو میں ٹھہرنا بالکل ناممکن تھا نتیجہ یہ ہوا کہ چینی، ہندی، فارسی، اسپینی، رومی، مصری، افریقی، غرض جو تہذیب بھی اس سے ٹکرائی چور چور ہو گئی۔

اس وقت مسلمانوں پر اسلامی نظریات چھائے ہوئے تھے، قرآن ان کی فکری و عملی قوتوں پر پورے طور پر حکمران تھا، جہاد اور اجتہاد کی روح ان کی رگوں میں برقی لہر کی طرح دوڑ رہی تھی، وہ محض فاتح اقوام نہ تھے بلکہ فاتح اذہان و قلوب بھی تھے، علم و فن کے پیشوا بھی تھے، صرف تلوار کے دھنی نہ تھے بلکہ قلم کے امام بھی تھے۔ قرآن سے روشنی لے کر انہوں نے علم و عمل کے گوشہ گوشہ کو منور کیا، تحقیق و اکتشاف کی راہ کھولی، اور اپنی مجتہدانہ

قوتِ فکر سے دنیا کی امامت کا منصب حاصل کر لیا۔ اس وقت علم تھا تو ان کا، تمدن تھا تو ان کا، تہذیب و سیاست تھی تو ان کی۔ ان ہی کی تحقیق، تحقیق سمجھی جاتی تھی، اور جس چیز کو وہ غلط ٹھہراتے تھے وہی غلط تسلیم کر لی جاتی تھی۔ ان کے علوم کے دھارے ایشیا سے گذر کر قسطنطنیہ اور اسپین کے راستوں سے یورپ کے خشک دماغی صحراؤں میں پہنچے اور صدیوں تک آبِ حیات کی طرح اس مردہ زمین کو سینچتے رہے یہاں تک کہ اس میں وہ نئی زندگی پیدا ہوئی جسے یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔ یہ زندگی اور روح اسی فکر اسلامی کی بخشی ہوئی تھی اور آج کوئی منصف مزاج یوروپین بھی اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا۔

فکری انقلاب کی یہ ایک لمبی داستان ہے جس کی تفصیل وقت کے ساتھ ایک مستقل تصنیف چاہتی ہے۔ یہاں ان اجمالی اشارات کو پیش کرنے کا مقصود صرف یہ ہے کہ اسلام کی اس حالت کا اندازہ لگایا جا سکے جو "بدأ غریباً" اور "سیعود غریباً" کے درمیان تھی، یعنی اس حالت کا جب کہ اسلام تقریباً پوری طرح غالب اور سربلند تھا اور اس کا نظام عملی دنیا میں ظاہر ہو کر جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔ کی عملی تفسیر بن چکا تھا۔ یہ نظام وہی اسلام کا "غریب" نظام اور یہ تعلیم اسلام کی وہی انوکھی تعلیم تھی جس پر کل تک سفاہت اور بے عقلی کے

فتوے لگائے جاتے تھے، جسے روم و ایران کی "مہذب اقوام" نے وحشت کی سند عطا کی تھی۔ جس کو سن کر حیرت و استعجاب کے قہقہے بلند کئے جاتے تھے لیکن ملے وقت کا کرشمہ کہو یا صداقت کی قوتِ تسخیر کہ دیکھتے دیکھتے عقل و سفاہت اور وحشت و تہذیب کا معیار بدل گیا۔ اب دنیا کو حیرت تھی تو یہ کہ ایسی "معروف تعلیم" پر کوئی حیرت کا اظہار کیسے کر سکتا ہے؟ اب معمورۂ ارضی کا ہر گوشہ اس "مانوس و مقبول" تصورِ حیات میں جذب ہونے کے لئے بے قرار تھا اور جو بات کل تک ضمیر کی توہین اور عقل کی موت خیال کیجاتی تھی وہی اب اس کی عظمت اور زندگی سمجھی جانے لگی۔ گویا سارے جہان کا زمین و آسمان ہی بدل گیا۔

یہ تو تھا اس "غریب تعلیم" کا حال۔ اور ان "غرباء" کا کیا حال ہوا جو کبھی وحشی مجنون، سودائی فریب خوردہ، احمق اور سفیہ کہے جاتے تھے؟ وہی حقارت کی نگاہوں سے دیکھنے والی دنیا اب ان کے قدموں میں پڑی ہے۔ فراعنہ وقت جھک جھک کر ان کی اطاعت کرنے میں عزت محسوس کرتے ہیں، تاج و تخت ان کے لئے خالی ہو رہے ہیں، ان کی فاتحانہ عزیمت کے سامنے زمین کی پہنائی سمٹی جاتی ہے اور ان کو جگہ دینے کے لئے قوموں کے دل و دیدہ بچھے جاتے ہیں۔

شام کے عیسائیوں کا حال آپ نے پڑھا ہوگا۔ ابھی انہیں مسلمانوں

کی حکومت میں آئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے اور ابھی اسلامی فوجیں اس نواح سے سرکی ہی تھیں کہ انہیں رومیوں کی جنگی تیاریوں کی خبر ملی۔ اگرچہ رومی حملہ آور ان کے اپنے ہم قوم اور ہم مذہب تھے، لیکن انہوں نے خود ان کے ارادوں کی اطلاع مسلمانوں کو دیدی۔ پھر جب مسلمانوں نے اس حملہ کی فوری مدافعت سے اپنے کو قاصر محسوس کیا اور جزیہ کی رقم انہیں واپس کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے یہ رقم محض تمہاری حفاظت کے لئے لی تھی، اس وقت ہم اس فرض کو پورا کرنے سے معذور ہیں اس لئے اس کا لینا بھی اسلام کی رو سے جائز نہیں، تو اہلِ شام کی آنکھیں اشک ریز ہو گئیں اور بے اختیار بول اٹھے کہ خدا تمہیں جلد واپس لائے۔

حق کی گیرائی اور عدل کی جاذبیت کا یہ کمال دیکھو کہ جو دنیا قومیت کی پجاری اور وطنیت پر مرمٹنے والی تھی اور اسلامی تعلیمات کو عقل و خرد سے نہایت فروتر جھتی تھی، وہی جب خلافت الٰہی کی نعمتوں کی لذت شناس ہو جاتی ہے۔ اور اسلامی نظام کو قریب سے اس کی اصلی شکل میں دیکھتی ہے تو خود بخود اس کی غلامی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیتی ہے۔

یہ تفسیر ہے "طوبیٰ للغرباء" کی اس سے بڑھ کر بھی مبارکی اور کامرانی حیات کی کوئی معراج ہو سکتی ہے؛ اور کیا اس سے آگے بھی انسانی فلاح و سعادت کی کوئی منزل ہے؛ اگر کہتے ہو کہ ہے تو تاریخ کے محفوظات

میں اس کی جستجو عبث ہے۔ دنیا اس غریب تعلیم کی صداقتوں سے انکار کرے لیکن اس کے پیدا کردہ اثر وانقلاب اور بخشی ہوئی عزت وسعادت کا انکار کس طرح کر سکتی ہے؟

یہ زمانہ تھا اسلام کے غلبہ اور تفوق کا۔ کچھ عرصہ تک تو اسے غلبہ کامل طور سے حاصل رہا اور جاہلیت بالکل ہی مغلوب و نامراد ہو گئی۔ پھر ایک طویل عرصہ تک بحیثیت مجموعی اسلام کو یہ تفوق حاصل رہا اور جاہلیت ہاتھ سے نکلے ہوئے میدان کو آہستہ آہستہ دوبارہ حاصل کرنے میں لگی رہی شکست کھا کر ہمیشہ کے لئے ہمت ہار کر بیٹھ جانا اس کے لئے مشکل تھا۔ اس کا مرجانا گویا شیطان کا مرجانا تھا۔ اور جبکہ شیطان قیام قیامت تک خیر وشر کا معرکہ گرم رکھنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے تو کیونکر ممکن تھا کہ اسلام وجاہلیت کا معرکہ اتنے جلدی ختم ہو جاتا۔ اسلام کی زبردست مار سے وہ کچھ عرصہ کے لئے بیہوش ضرور ہو گئی تھی، مگر مری نہ تھی جونہی کہ اس کو ہوش آیا اس نے اپنے حریف کی حکومت کے خلاف بغاوت پر کمر باندھ لی اور جذبات وخواہشات نفس کی زہریلی گیس دماغوں میں پہنچا پہنچا کر قوائے عقلیہ کو ماؤف کرنا شروع کر دیا۔ اس کی یہ جوابی حرکت تیس برس کے بعد ہی شروع ہو چکی تھی یعنی اس ذہنی انقلاب کا آغاز ہو گیا تھا جس کی پیشین گوئی "وَسَيَعُودُ غَرِيبًا" کے الفاظ میں کی گئی تھی۔

پہلے تو دماغوں سے وحدتِ قومی کی اہمیت فراموش ہونی شروع ہوئی خلافت راشدہ کا دَور ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کی آڑ لے کر خوارج کا ایک الگ فرقہ وجود میں آیا۔ چند سال بعد تشیع کا فتنہ اٹھا اس کے بعد جو لمحہ آتا گیا تفرق اور تشتت کا ایک نیا پیام لے کر آیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے شیرازۂ ملت کے سینکڑوں ٹکڑے ہو کر بکھر گئے مسلمان کی تلوار مسلمان ہی کے خون سے سیراب ہونے لگی۔ اسلام کے نام لیوا بعضہم ببعض کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ اس کے اشارے سے خود اہل ملت ہی نے اتحاد کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ اور اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ کا ربانی شعارِ قومی ترک کر کے انہوں نے اَعِزَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ کے جاہلی شعار کو قبول کر لیا۔ یہ سب کچھ اس قرآن کے پیرؤں نے کیا، اور شاید بعضوں نے حمایتِ حق اور غیرتِ اسلام سمجھ کر کیا جس نے اختلاف و افتراق کو بغی اور شرک کا نشان قرار دیا تھا۔ انہوں نے اسلامی قومیت کی روحِ حیات کو اپنے چند سیاسی جزئی اور اجتہادی مسائل کے بدلے بیچ دیا درانحالیکہ ایک نبی ہارون علیہ السّلام نے اپنی قوم کو محض اس لئے گوسالہ پرستی سے روکنے میں تامل کیا تھا کہ مبادا اس میں پھوٹ نہ پڑ جائے۔ لیکن اسلام کے نادان دوستوں نے حق کے نام پر وہ سب کچھ کر کے رکھ دیا جو شاید اس کے خونی دشمنوں سے قیامت تک سرانجام نہ پاتا۔

اس کے بعد جاہلیت نے اسلامی نظریۂ خلافت پر یورش کی اور اسے ملوکیت میں بدل کر رکھ دیا حکومت آبائی وراثت بن گئی۔ اقامت عدل کے بجائے نفس پروری اور جاہ طلبی اس کی مقصود قرار پائی اور بنو امیہ اور بنو ہاشم کی رقابت کی دبی ہوئی چنگاریوں نے بھڑک کر قومی و نسلی عصبیت کی وہ مہیب بھٹی تیار کی جس نے اسلامی نظام خلافت کو جلا کر ہمیشہ کے لئے خاکستر بنا دیا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ منحوس انقلاب ہزارہا تربیت یافتگان فیض نبوت کی موجودگی میں برپا ہوا تو ہماری عقل اسلامی نظریۂ حکومت کی بلندی اور عظمت پر حیران رہ جاتی ہے کہ یہ اپنے قیام و بقا کے لئے کتنی زبردست اخلاقی طاقت اور کتنا باطنی تزکیۂ نفس چاہتا ہے۔

جب اسلامی نظام کے یہ دو ستون ہل گئے تو پھر جاہلیت کی تخریبی مساعی کا زور آہستہ آہستہ بڑھتا گیا اور اس نے ایک ایک کر کے اسلامی تصورات کو دبانا شروع کیا۔ انتظام حکومت میں عجمی تخیلات کام کرنے لگے۔ نومسلموں پر جزیہ لگایا گیا۔ ایوان خلافت شداد کا محل بن گیا۔ تقویٰ اور دیانت کے ساتھ ساتھ احکام دین کی معرفت بھی خلافت کے شرائط اور فرائض میں سے نکال دی گئی، جہلا خلیفۃ اللہ اور ظل اللہ بننے لگے۔ کچھ دن اور گذرے تھے کہ نظریات قرآنی کی خلافت دینی کی یادگار بھی ــــ اپنی ..... جو اپنی روحانی اسپرٹ پہلے ہی کھو چکی تھی

مادی شوکتوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ مذہب کے ساتھ ہی حکومت کے بھی تار تار الگ ہو گئے، مرکزیت ختم اور طوائف الملوکی کی لعنت پوری قوم پر مسلط ہو گئی، خلافت اسلامی نام کے لحاظ سے ایک رہی۔ لیکن عملاً ہندوستان سے لے کر بربر اور اندلس تک متعدد خلافتیں یعنی ملوکیتیں قائم ہو گئیں، امرانے اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامت عدل کے بجائے ملک گیری اپنا مقصد جنگ قرار دے لیا اور اسلامی اصول و نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے بجائے مال و زر کی ہوس ان سے تلوار اٹھوانے لگی۔ اسلامی رُوح جہاد سرد پڑ گئی۔ بت شکن بت فروش بن گیا، اور آسمانی بادشاہت کے کفن بردوش سپاہی میدانِ جہاد سے بھاگ کر دنیا طلبی کے خرابات میں معتکف ہو گئے جہاں نفس و جاہلیت کی زندگی اور عقل و اسلام کی موت تھی۔

ایک طرف سے امت مرحومہ اس سیاسی اور مادی زوال آفرین انقلاب سے دوچار ہوئی اور دوسری جانب سے فکری و علمی انقلاب اس کے لئے ایک اور تباہی لے کر رونما ہوا۔ ابھی قرآن کی رہنمائی میں مسلمانوں نے تحقیق و اجتہاد اور اکتساب علم کی چند ہی صدیاں گذاری تھیں کہ انہوں نے اپنے اوپر غور و فکر کا دروازہ بند کر لیا، اور یہ سمجھ لیا کہ اب دنیا اپنے آخری مرکز پر پہنچ گئی ہے، قرآن کے سینے میں علم و حکمت کے جتنے خزانے محفوظ تھے سب کے سب تین چار سو برس میں نکالے جا چکے ہیں، اب اس کے

آئے تفقہ اور تفکر کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جاہلی افکار اور تخیلات نئے نئے لباس میں پیدا ہوتے رہے اور دنیا ان کے سیلاب میں بہتی گئی، لیکن مسلمان اسلامی نظریات کو زمانہ کے مطابق پیش کر کے اس عالمگیر سیلاب کو ذہنیتوں پر چھا جانے سے نہ روک سکے۔ دنیا میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے گئے تمدن آگے بڑھا، سیاست نے رنگ بدلا، علوم کی متعدد شاخیں پھوٹیں، تحقیق و جستجو نے کائنات کے عجیب عجیب اسرار کھولے، ٹھیری ہوئی زمین متحرک ہو گئی، کھوج لگانے والوں نے ایک نئی دنیا ڈھونڈھ نکالی، مگر وائے افسوس مسلمان جمود کی تاریکی میں غفلت کی نیند سوتے رہے اور زمانہ کا کاروان برق رفتار ان کو سوتا چھوڑ کر صدیوں آگے نکل گیا۔ پھر جب وہ خود ہی دنیا کی امامت اور رہنمائی سے استعفاء دے چکے تھے تو قدرت . . . دوسروں کو ان کی جگہ کیوں نہ بخشتی؟ جہاد اور اجتہاد یعنی جوش عمل اور روح تحقیق، دونوں سے یہ خالی ہو چکے تھے، ان کا قلم شکستہ اور ان کی تلوار زنگ آلود ہو گئی تھی اور یہی وہی دونوں حیثیتوں سے یہ قوم اس قابل نہ رہی تھی کہ دنیا کی امامت کر سکے اور زمانہ کی رفتار کو اپنے قابو میں رکھ سکے۔ اب ان کی خاطر پیشوائی کا منصب کیوں اور کب تک خالی رہتا؟ دوسرے اٹھے۔ انہوں نے اصول جاہلیت پر اجتہاد کیا، اور راہ طاغوت میں جہاد کیا۔ یہاں تک کہ وہ اہی

جیزوں کو لیکر دنیا کے پیشوا بنتے چلے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا اور یہی ہونا تھا کہ اسلام کا سیاسی اور فکری اقتدار گھٹنے لگا اور اسکی جگہ جاہلیت کی حکمرانی دماغوں اور جسموں پر قائم ہونے لگی۔

اگرچہ بحیثیت مجموعی جاہلیت پانچ سو برس بعد ہی اسلام پر غالب آگئی تھی مگر اسلام کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایک طویل مدت تک بالکل مغلوب یعنی مکمل "غریب" نہ ہو سکا۔ اگرچہ یونانی نظریات، ایرانی خیالات اور ہندی تصورات نے اثر ڈال کر اس کی طاقتور روح کو مجروح بنانا شروع کر دیا تھا، مگر ایک تو ان غیر قرآنی افکار و تخیلات کی پشت پر کوئی مادی قوت نہ تھی، دوسرے قرآن کے اصول خود اپنے اندر صحت و توانائی کا کامل وصف رکھتے تھے اس لئے ابتدائی حملے کچھ بہت زیادہ کارگر نہ ہوئے۔ اس دوران میں تین چار صدیوں تک ــــ جب کہ مسلمانوں کے اندر جہاد و اجتہاد، دونوں کی روحیں سرد پڑی تھیں ــــ کوئی مرد میدان اس قوت اور عزیمت کا بھی نہ اٹھا جو مسلمانوں کی خالی کی ہوئی مسند امامت پر ذرا قابض ہو جاتا اور اپنے سیاسی استیلاء سے دنیا کے افکار و خیالات پر اپنا غیر اسلامی تسلط جما لیتا۔ اس وجہ سے اسلامی اصول و نظریات کا جو صور صدر اول کے مسلمانوں نے اپنی بلند آہنگی سے پھونکا تھا، اس سیاسی سستی کے باوجود اس کی صدائے بازگشت کے فضائے عام میں گم ہوتے ہوتے کئی صدیاں گذر گئیں۔ اور

اپنی کامل فتحمندی کی آرزوؤں سے ہمکنار نہ ہو سکی۔

لیکن چار سو برس کی اس طویل مدت میں جبکہ مسلمان اپنے اسلاف کے بچھاتے ہوئے بستر پر آرام سے سو رہے تھے، افق مغرب پر ایک زبردست انقلاب کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور حریت فکر اور علم وحکمت کی جو چند کرنیں خود مسلمانوں نے اس افق تک پہنچا دی تھیں وہ بڑھتے بڑھتے ایک عظیم الشان آفتاب بن رہی تھیں۔ آخر کار جب حوادث روزگار کے تازیانوں نے ان مدہوشوں کی آنکھیں کھولیں تو انہوں نے دیکھ لیا کہ جو سورج کبھی مشرق کے افق سے نکلا تھا وہ آج مغربی افق سے نکل رہا ہے، صرف نکل ہی نہیں رہا ہے بلکہ وسط آسمان پر چمک رہا ہے، اور ساری دنیا اس کی تیز نگاہی سے مرعوب ہے، اور سب هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَکْبَرُ کہکر اس کے سامنے جھکے جا رہے ہیں، اور تمام کے تمام خواہ وہ اپنے کو مسلمان کہتے ہوں یا کچھ اور، زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ آج جاہلیت کی فتح کامل ہو گئی اور جو مہم اس نے پہلی صدی ہجری کے وسط میں اسلام کے خلاف شروع کی تھی وہ بارھویں صدی میں آکر اپنی کامرانی کے آخری نقطہ پر پہنچ گئی اور وقت آگیا جو "سَیَعُوْدُ غَرِیْبًا" کے مکمل ظہور کا وقت تھا۔

حرماں نصیبی عقل دا اسلام کی یہ کتنی دلدوز داستان ہے کہ علم و

وحکمت اور آزادی فکر و رائے کے جو ہتھیار اس نے یورپ کو دئے تھے تاکہ وہ ان سے اپنی صدیوں کی جہالت کا مقابلہ کرے؛ اس نے انجام کار ان ہتھیاروں کا تختۂ مشق اسلام ہی کو بنا لیا اور جب وہ مسلمانوں کی خالی کی ہوئی جائے امامت پر آیا تو اسلامی نظریات اور تعلیمات سے مانوس اور معتقد ہونے کے بجائے بالکل ہی اس سے متوحش اور بیگانہ تھا۔ اس کی وجہ سمجھنے کے لئے آپ کو یورپ کے ذہنی وفکری انقلاب یعنی اس کی نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی دور پر ایک نظر ڈالنی چاہئے۔ یہ تو مسلم ہے کہ یورپ کی تاریک روح کو اسلامی فکر کی روشن اور ہمہ گیر کرنوں ہی نے منور کیا اور کلیسائی اوہام وخرافات کی غلام عقل کو قرآن کی حریت نواز عقلیت ہی نے آزاد کرایا۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ قرآنی تصورات اور نظریات کو وہ اچھی طرح ہضم نہ کر سکا تھا۔ بلکہ محض اسکی چند موٹی موٹی باتوں کو اس نے سطحی طور پر اچک لیا تھا۔ اس کے علاوہ صلیبی لڑائیوں اور یورپ کی مسلسل پسپائیوں نے عیسائی اقوام میں اسلام کے خلاف تعصب اور نفرت کی ایک ہمہ گیر وبا پھیلا رکھی تھی۔ اس وجہ سے وہ علم وحکمت کے میدان میں آگے بڑھنے کے باوجود اسلامی تصورِ حیات سے بیگانہ تر ہوتا چلا گیا۔ اور اسکی ترقی کا رخ بالکل غلط اور فطرت کش راہ پر پڑ گیا۔

سوءِ اتفاق سے یورپ میں مذہب کے نام سے عیسائیت پھیلی ہوئی

تھی. جو خود عقل و فطرت سے برسرِ پیکار تھی. جب اسلام کے اثر سے یورپ نے اوہام کی تاریکیوں سے نکل کر فکر و نظر کی آزاد فضا میں آنا چاہا تو مذہب عیسوی نے پوری قہر سامانیوں کے ساتھ اس آزادی کو فنا کرنے کی کوشش کی. حریت پسند کافر قرار دئے گئے مذہبی عدالتیں قائم ہوئیں اور اس فکری و علمی انقلاب کے علمبرداروں کو انتہائی وحشیانہ اور انسانیت سوز سزائیں دی گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ آزادیٔ نظر کی یہ آگ دبنے کے بجائے اور بھڑک اٹھی اور چونکہ مذہب کا نام لے کر مذہبی پیشواؤں نے اس تحریک کی مخالفت کی تھی اس لئے قوت پکڑنے کے بعد پہلے تو اس آگ نے پوپ اور چرچ کے مقدس اقتدار کو پھونکا، پھر عیسائیت کی خبر لی اور آخر میں نفس مذہب اور مذہبیت کو جلا کر رکھ دیا، کیونکہ اس مخالفت نے یہ تخیل پیدا کر دیا کہ علم و حکمت عین ضد ہے مذہب کی اس لئے جب تک راستہ کا پتھر نہیں ہٹتا علم کے میدان میں ہم آگے نہیں جا سکتے. اور چونکہ مذہب کی بنیاد خدا اور قانونِ مجازات کے اعتقادات پر ہے، اس لئے جوش انتقام میں انہوں نے دشمنوں کی اس یادگار کو بھی مٹا دینے کی ٹھان لی اور الٰہی نظریہ سے بالکل آزاد ہو کر اسرارِ کائنات کی گتھی سلجھانے لگے۔

اس طرح مغربی فلسفہ و سائنس نے "نیچریت" (Naturalism) کی داغ بیل ڈالی۔ اگرچہ سترھویں صدی تک وہ اپنے اس جدید رجحان کو

اچھی طرح نہیں سمجھ سکے تھے، اس لئے نیچریت کے ساتھ ساتھ خدا پرستی
اور مذہبی اخلاق کو بھی نباہنا چاہتے تھے لیکن یہ دو کشتیوں کا سفر زیادہ
دیر تک جاری نہیں رہ سکتا تھا اور نہ رہا - آخر کار اٹھارہویں صدی میں ہیوم
لبناخ، لائبنڑی، مانٹکیو اور روسو وغیرہ آزاد خیال فلاسفہ نے اس ذہنی
انقلاب کے رخ کو قریب قریب بالکل مادہ پرستی کی طرف پھیر دیا - انیسویں
صدی میں یہ مادیت اپنے کمال کو پہنچ گئی اور یہ آزاد خیالی اور عقلیت کی
عدالت میں کسی مافوق الطبیعت ہستی کے اعتقاد سے بڑھکر کوئی عظیم گناہ نہ تھا
پھر ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے اور اس نظریہ کی ترجمان کتاب اصل الانواع
(Origion of species) نے جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی تھی اس
نظریہ مادیت کو ایسا استحکام بخشا کہ گویا وہ ایک ناقابل انکار سائنٹفک
حقیقت ہے۔ اسی نظریہ کے پیٹ سے یورپ کا موجودہ نظام سیاست اور اس کا نظام تہذیب
تمدن، اس کے اصول معاشرت، اس کے اخلاقی تصورات اور اس کے
معاشی نظریات پیدا ہوئے۔ اشتراکیت کا برگ و بار بھی اسی اصل سے
پھوٹا - امپریلزم، ادر ظالمانہ سرمایہ داری اور فاشزم کو بھی اسی نے جنم دیا -
غرض دنیا کا سارا نظام زندگی، خدا پرستی اور عقل و فطرت کے صحیح تصورات
کے بجائے نفس اور حیوانیت کے مقتضیات پر قائم ہو گیا، اور آج یورپ
اور اس کے غلام ایشیا میں علی الاعلان ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے کہ روح کا

مستقر نہ دل ہے نہ دماغ بلکہ معدہ اس کا مستقر ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے شہوات کی تحریک سے ہوتا ہے۔ فکر و نظر اور تمیز و ارادہ سب ان مراکز تحریک کے تابع ہیں جو پیٹ اور اس کے حوالی میں واقع ہوتے ہیں! رہی عقل تو اس کا وظیفہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ شہوات کے لئے ایک با تدبیر خادم کا کام دے، چنانچہ پروفیسر جوڈ اپنی کتاب گائڈ آف ماڈرن تھاٹ (Guide of modern thought) میں صاف کہتا ہے کہ :-

"عقل درحقیقت ہماری خواہشات کی لونڈی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ جو مقاصد ہم غیر شعوری طور پر متعین کریں وہ ان کے حصول کے لئے ذرائع بہم پہنچائے اور جو کچھ ہم کرنا چاہیں اس کے جواز کے لئے دلائل مہیا کر دے"۔

اور ڈاروِن یہ ثابت کر ہی چکا ہے کہ انسان ایک اعلیٰ درجہ کا ترقی یافتہ حیوان ہے۔ اس لئے لامحالہ اس کی سعادت اور خوش نصیبی کا کمال بس یہی ہے کہ اپنے نفسانی اور حیوانی مقتضیات کو پورا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ اسباب و وسائل اور لذیذ سے لذیذ طریقے ایجاد کرے!

یہ ہے اس یورپ کے نزدیک معیارِ فطرت و انسانیت، جو آج بلا شرکت غیرے پورے کرۂ ارض پر امارت کے فرائض انجام دے رہا ہے اور

اسی نقطۂ نظر کا ڈھالا ہوا ہے وہ نظامِ حیات جو اس کے قلم اور تلوار کے زور سے ساری اقوامِ عالم کے تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور اقتصاد و سیاست پر، نیز ان کے افکار و تصورات پر حکمرانی کر رہا ہے۔ اس کا ل قلب ماہیت اور فسادِ مذاق کے بعد کیا تمہیں توقع ہے کہ وہ ان اسلامی تصورات اور نظریات سے وحشت اور بیگانگی نہ محسوس کرے گا جو خالص عقل، بے آمیز فطرت اور بے داغ انسانیت کی بنیادوں پر قائم ہیں، اور جن کا خمیر نفسانیت اور حیوانیت کے عناصر سے بالکل پاک ہے؟ کیا تم امید رکھتے ہو کہ یہ پیٹ اور شہوت کی غلاظتوں میں لوٹنے والا کیڑا اگر فضائے آسمانی کی غیر مرئی بلندیوں تک اڑنے لگا۔ یا سمندر کی متلاطم لہروں کو چیرتا ہوا چلنے لگا تو یہ قرآنی افکار و نظریات کی بلندیوں اور گہرائیوں تک بھی پہنچ سکتا ہے؟ پھر کیا تمہیں یہ یقین ہے کہ قرآن کی اس روشنی کو جسے کبھی ساری دنیا نے روشنی سمجھا اور عقل و فکر کے بجھے ہوئے چراغوں کو اس سے روشن کیا تھا، آج بھی وہ دنیا اس روشنی کو روشنی ہی سمجھ رہی ہے؟ اگر یہ بات نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو بس سمجھ لو کہ "سَیَعُودُ غَرِیْبًا" کا منحوس دَور اسلام پر مسلط ہو چکا، جاہلیت پوری طرح انسانی اعمال و افکار پر چھا چکی، اسلام "غریب" بن کر کس مپرسی کی اوٹ میں چھپ چکا۔ قرآن کے ساتھ جو بے انصافی اب سے ۱۳۷۰ برس پہلے ہوئی تھی وہی اب پھر ہونے لگی

ہے۔ اس کی تعلیمات کی اساس جن بلند اور حکیمانہ تصورات پر رکھی گئی ہے ان کی سمائی جس طرح ساتویں صدی عیسوی کے تنگ دماغوں میں نہ ہوتی تھی اسی طرح آج بیسویں صدی کے مدعی وسعت دماغوں میں بھی نہیں ہوتی۔ دنیا کی عقل اتنے اکتشافات اور تحقیقات کے باوجود ان بلند حقائق سے وہی اجنبیت اور نامانوسیت محسوس کر رہی ہے جو جاہلیت اولیٰ نے محسوس کی تھی۔ اس کی شپرہ چشمی اب بھی اس آفتاب حق کو تاریک ہی دیکھ رہی ہے۔ یہی اس کی بدبختی کا راز کل ہے اور یقین کرو کہ اس بدبختی کے ذمہ دار صرف یورپ کے ائمۂ کفر ہی نہیں ہیں خود ہم بھی ہیں۔ بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اگر ہم جاہلیت کے آگے سرنگوں نہ ہوتے تو دوسرے بھی نہ ہوتے اگر ہم خود "سیعود غریبا" کی پیشگوئی پوری نہ کرتے تو دنیا اس ظلمت میں مبتلا نہ ہوتی۔ اگر خود ہمارے اعمال و افکار سے روح قرآنی نہ نکل جاتی تو دوسرے بھی آبحیات کو زہر نہ سمجھتے۔ لیکن ملہم غیب کی پیشین گوئی پوری ہونے والی تھی، پوری ہو کر رہی اور جاہلیت کے خس و خاشاک نے اسلام کے چشمۂ حیواں کو نگاہوں سے بالکل اوجھل کر کے ہی چھوڑا۔ اگر مغرب اس سے بیگانہ ہے تو مشرق کب اس کا محرم ہے؟ یہ میرا اپنا دعویٰ ہی نہیں بلکہ حالات اور واقعات کا اعلان ہے اور جاہلیت جدید خود اس اعلان کی تصدیق کرتی ہے۔

موجودہ علم و حکمت کے نتائج

ہم مضمون کی ابتدا میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ معقول خالص یعنی اسلام کا سرچشمہ انسان کی وہ سلیم اور بے آمیز فطرت ہے جو اسے حیوانی پستیوں سے اٹھانا اور خلافت الٰہی کی بلندیوں تک لے جانا چاہتی ہے اور یہی وہ جوہر ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے اس کے بالمقابل جاہلیت کا سرچشمہ نفسِ حیوانی ہے جو اس امتیاز کو فراموش کر دینا اور انسانیت و حیوانیت کے حدود کو محو کر دینا چاہتا ہے۔ جاہلیت اولیٰ کا جو حال ظہور اسلام کے وقت تھا اس کی اجمالی داستان آپ پڑھ چکے ہیں جس میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس جاہلیت میں باوجود جاہلیت ہونے کے کچھ نہ کچھ حیا ضرور تھی اس نے کم از کم انسان کا نام تو انسان باقی رکھ چھوڑا تھا۔ مگر آفرین ہو آج کی "مہذب" جاہلیت پر اور مبارک ہو اس کی شانِ فاتحیت اور اس کی بے باکانہ جرأت کہ اس نے اس پردۂ حیا کو بھی اپنے چہرے سے نوچ پھینکا اور ڈارون کی امت نے — جو اس جاہلیت کبریٰ کی قائد بن کر سطح سطح ارض کے چپہ چپہ پر پھیلی ہوئی ہے — امتیاز انسانیت کے اس ننگ کو گوارا کرنے سے علی الاعلان انکار کر دیا۔ اب وہ اپنے آپ کو حیوان کہنے اور کہلانے پر مصر ہے۔ انسانیت کو ایک لفظ بے معنی، اخلاق کو معدہ کا تابع اور عقل و دماغ کو خواہشاتِ نفس کا چاکر قرار دے رہی ہے

اور ایک طرف اپنے اس نظریہ کا زبان سے اقرار کر رہی ہے تو دوسری طرف اپنے نظامِ تہذیب اور دستورِ حیات کی اساس اسی نظریہ کو قرار دے چکی ہے۔ پھر بتاؤ اسلام کی اُن فطری تعلیمات اور عقلی نظریات سے اس مہذب دنیا کو کیا اُنس اور لگاؤ ہو سکتا ہے جن کی تہ میں سارے عناصر موجود ہیں لیکن حیوانیت اور نفسانیت کا کوئی عنصر نہیں جو آخر دونوں کا یہ فطری بعدالمشرقین، یہ اختلاف مقاصد، یہ تضادِ افکار اور یہ تباین مزاجی کیوں کر ایک کو دوسرے سے قریب ہونے دے گا؟ دو مختلف سمتوں کے مسافر کے مقدم ایک دوسرے کا ساتھ دے سکیں گے؟ اسلامی تصورات و نظریات اس تہذیب کے دماغ میں کس طرف سے گھس سکیں گے؟

جاہلیت قدیمہ خدا کی منکر نہ تھی صرف خدائی کی وحدت اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ الوہیت کو بشریت کی میزان میں تول کر قیاس کرتی تھی کہ ایک اکیلا خدا اتنے بڑے نظامِ کائنات کو کیسے چلا سکتا ہے۔ اس لئے وہ الوہیت کو بہت سے شرکا اور مددگاروں میں تقسیم کر دیتی تھی۔ تاہم اس نے الوہیت کو حکمت، علم، قدرت اور ارادہ سے منفک نہ کیا تھا۔ مگر اس نئی جاہلیت کو دیکھو۔ یہ سرے سے ایک حکیم و دانا فاعلِ مختار ہی کی ضرورت اس نظامِ کائنات کے لئے تسلیم نہیں کرتی۔ اس کو جس عقلیت (Rationalism......) پر ناز ہے، وہ کائنات کا انتظام

ایک ایسی اندھی فطرت (Blind nature) ایک ایسی جاہل طبیعت کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتی ہے جو نہ علم رکھتی ہے نہ ارادہ کہ نہ کچھ سوچتی ہے، نہ دیکھتی ہے، نہ سنتی ہے۔ اس کے سامنے اگر آپ کہیں کہ گراموفون خود بخود بن گیا۔ یا اس کو ایک ایسی طاقت نے بنا دیا، جو اندھی بہری، بے عقل اور بے علم تھی تو وہ آپ پر ہنسے گی اور کہے گی کہ کیا جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ مگر خود وہ بے تکلف حکم لگاتی ہے کہ یہ عظیم الشان کارخانۂ عالم کسی صانع علیم و حکیم کے بغیر وجود میں آیا ہے اور اس کے بغیر چل رہا ہے مادے میں زندگی خود بخود ایک طبعی عمل سے پیدا ہو جاتی ہے، زندہ مادے سے یہ بے شمار انواع نت نئے ڈیزائن پر خود بخود ایک طبعی ارتقاء کے ساتھ بنتی چلی جاتی ہیں، انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق کو محض تنازع للبقاء (struggle for existence) اور انتخاب طبیعی (Natural selection) اور بقائے اصلح (survival of the fittest) نے کیڑے سے انسان بنا دیا، حتیٰ کہ اس میں عقل ایک بے عقل طاقت نے پیدا کر دی، اس میں شعور ایک بے شعور قانون کے زور سے آگیا، اور اس میں محبت ایک ایسے منبع سے آگئی جہاں خود محبت موجود نہیں۔ ایسی ہولناک جہالت کی باتیں وہ کسی شرم کے بغیر کہتی ہے اور کسی شرم کے بغیر ان کو سائنس اور حکمت اور عقلیت کے نام سے کتابوں میں لکھتی اور

یونیورسٹیوں میں پڑھاتی ہے۔

پھر جہل مرکب ملاحظہ ہو کہ اس کو ہنسی اپنی جہالت اور بے عقلی کی باتوں پر نہیں، بلکہ اس کی باتوں پر آتی ہے جو اسے حقیقت کا علم دینا چاہتا ہے اور کائنات کے عقلی مطالعہ کا پہلا اور بنیادی سبق دیتا ہے۔ قرآن خدا کے وجود پر فطرت و وجدان کی شہادت پیش کرتا ہے تو وہ اسے وہم پرستی، جہالت، تنگ نظری بتاتی ہے۔ قرآن آفاق کائنات کے کھلے ہوئے آثار و بینات میں وجود باری کی جھلک دکھاتا ہے تو وہ منہ پھیر لیتی ہے اور خدا کے ہر معجزے کی "سائنٹفک توجیہیں" کرنے لگتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب تم اینٹوں اور پتھروں کی ایک چھوٹی سی عمارت دیکھ کر یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ اس کا کوئی معمار نہیں اور نہ کسی مقصد سے یہ بنائی گئی ہے، تو کائنات کی اس وسیع عمارت کا جس کی وسعت تمہاری نگاہ و وہم سے بھی پرے ہے اور جو ایک خاص شکل، وضع، مقصد اور حکمت کے ماتحت بنی ہے، کوئی معمار — دانا اور حکیم معمار — کیوں نہیں ہے؟ وہ جواب دیتی ہے کہ بے شک عمارت تو ایک دانا و بینا معمار کے بغیر نہیں بن سکتی، مگر اس کائنات کے متعلق ہم یہ ماننے پر مجبور نہیں کہ وہ اتفاقاً وجود میں آئی ہے اور اس کے قوانین ایک قانون بنانے والے کے بغیر خود بن گئے ہیں، اور ایک نافذ کرنیوالے کے بغیر خود نافذ ہو رہے ہیں، کیونکہ اگر ہم یہ نہ

مانیں تو خدا کو ماننا لازم آئے گا، اور خدا ہی کو ہم نہیں ماننا چاہتے۔ قرآن اس عالم اور اس کی ایک ایک چیز میں چھپی ہوئی بے شمار حکمتوں کی طرف رہنمائی کر کے پوچھتا ہے کہ بتاؤ کائنات کے مختلف اجزاء میں یہ توافق (Harmony) کہاں سے آیا؟ اس پوری مشین کے پرزے کیونکر فٹ ہو گئے؟ اگر یہ زمین و آسمان یہ چاند سورج یہ بیشمار سیارات اور لاتعداد کرّے بغیر کسی حکمت کے خود پیدا ہو گئے تو ان کا یہ توازن اور یہ ٹھیک ٹھیک انداز کیسے قائم ہو گیا؟ زمین کے دامن میں یہ صلاحیت کیوں پیدا ہوئی کہ وہ تمہارے پلنے پھرنے رہنے سہنے کی ضروریات کے سامنے جھکی رہے؟ مٹی کے اندر یہ استعداد کہاں سے آئی کہ آسمان کی دی ہوئی بارش کو قبول کر کے بیج کو روئیدگی بخشے؟ پانی کے مزاج میں بھاپ بن کر ہوا کے کندھوں پر اڑنے اور پھر زمین پر برسنے کی قابلیت کس طرح پیدا ہوتی؟ کیا اجزائے کائنات میں اس تاثیر و تاثر کی موجودگی ذراتِ مادّہ کا یہ باہمی تعاون ہزاروں کروں کا یہ باہمی توافق اپنے پسِ پشت کوئی حکیم اور فعّالٌ لِمَا یُرِیْد ہستی نہیں رکھتا؟ وار اور پھر قرآنی استدلال کا وار سخت سہی لیکن جاہلیت فوراً "اتفاقات" اور "مادہ کے طبعی خواص" کی سپر سامنے کر دیتی ہے۔ اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو جھنجھلا کر وہی بات کہتی ہے جو چار ہزار برس پہلے کا جاہل انسان کہتا تھا کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی

نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً۔ "ہم ہرگز نہ مانیں گے جب تک کہ خدا کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں"۔ یعنی وہی قدامت پرستی، وہی دقیانوسیت! وہی بوسیدہ خیالی جس پر جدید زمانہ کا انسان روزانہ ہزاروں مرتبہ تبرّے بھیجتا ہے! بات کو فلسفیانہ آب و رنگ دے کر ایک نئے سانچے میں ڈھال لیا گیا ہے۔ جامہ پوشی کا ڈھنگ چاہے کچھ ہو "اندازِ قد" تو وہی ہے پہچاننے کے لئے محض شناسا نظر کی ضرورت ہے۔ ربانی عظمت و کبریائی کے بلند تخیل سے جس طرح اگلوں کا جہالت زدہ دماغ قاصر رہا اور جس طرح ایمان لانے کے لئے دقیانوسی دور میں اس بے پایاں حقیقت کے محسوس اور مرئی ہونے کی شرط لگائی گئی، ٹھیک اسی طرح آج بھی مطالبہ ہو رہا ہے کہ جب تک انسانی تجربہ اور مشاہدہ میں کوئی چیز نہیں آتی اس پر ایمان لانا عقل کی توہین ہے۔ حکمتِ حاضرہ خدا کے عدم پر سب سے بڑی دلیل جو قائم کر سکی ہے وہ یہی ہے۔

خدا کی طرح قیامت اور حشر و نشر کا نظریہ بھی اسی بناء پر قابلِ قبول ہے، مرنے کے بعد از سر نو جی اٹھنا آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے عرب کے وحشی بدّو کی نگاہ میں جس قدر مستبعد اور حیرت خیز تھا، اس سے کہیں زیادہ محلِ تعجب وہ آج اس بیسویں صدی میں یورپ کے مہذب ڈاکٹر کی نگاہ میں ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جسم کے جو ذرات خاک میں مل کر خاک ہو

گئے۔ ہوائے تیز و تند جھونکوں نے جن اجزا کو مشرق و مغرب میں پھیلا دیا وہ دوبارہ یکجا مجتمع ہو کر پھر زندہ شکل اختیار کر لیں گے؟ وہ کہتا ہے کہ مارنے اور جلانے والی کسی ہستی کا تخیل محض وہم پرستی کی ایجاد ہے، ورنہ دراصل بے جان اجزائے مادی کو نہ کوئی بیرونی طاقت ترتیب دے سکتی ہے نہ ان میں جان پیدا کرتی ہے۔ مادہ خود اپنے نظم میں ترقی کر کے جاندار ہیئت میں متشکل ہو جاتا ہے۔ جب یہ نظم درہم برہم ہو جائے گا۔ تو اس کے امتزاج خاص کی طبیعت نے جو قوتِ حیات اور انرجی پیدا کر رکھی تھی وہ فنا ہو جائے گی اور یہ فنا اس جسم کی فنائے محض ہے۔ کوئی تجربہ یا مشاہدہ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ اس کالبدِ خاکی میں "رُوح" نام کی کوئی چیز باہر سے آتی ہے اور اس سے نکل جانے کے بعد بھی موجود رہتی ہے۔ اسی طرح کوئی مشاہدہ اس امر کا بھی نہیں ہوا کہ کوئی شخص مر کر جی اٹھا ہو۔ لہذا یہ حشر و نشر، یہ عذاب و ثواب، یہ سزا و جزا، سب کے سب نافہمی اور ضعفِ عقل کی وسوسہ آفرینیاں ہیں۔ جو چیز ہمارے تجربات اور مشاہدات کے اندر آئے وہی حقیقت ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سراسر افسانہ ہے، وہم ہے، تنگ نظری اور تاریک خیالی ہے، جنون اور عجائب پرستی ہے۔ سلسلۂ کون و فساد کو دیکھ کر ہم یہ تو تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ نظامِ عالم درہم برہم ہو سکتا ہے۔ اس امکان سے بھی انکار نہیں

کہ کل کوئی کرّہ سماوی زمین سے ٹکرا جائے اور وہ پاش پاش ہو کر اپنی موجودہ ہیئت بدل دے۔ کیونکہ اس قسم کے حوادث کے آثار کا ہم مشاہدہ کر چکے ہیں۔ لیکن اس فنا کے بعد کوئی بقا یا اس فساد کے بعد کوئی اور کون ہوگا یہ چیز ہمارے محسوسات و مشاہدات کے دائرہ میں نہیں آتی ہے۔ پھر اسے کیوں مانیں؟

قرآن پھر ان کی فطرت سے اپیل کرتا ہے اس صحیفۂ کائنات کی نمایاں سطروں کو پڑھ کر سناتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کیسی روشن حیرانی ہے جس کی تاریکیوں میں تم کو ربانی کرشموں سے بھری ہوئی اور تمہاری آنکھوں کے سامنے کھلی ہوئی کائنات کے اندر کوئی نشان حیات بعد الموت نظر نہیں آتا؟ تم دیکھ رہے ہو کہ ہر فساد کے بعد ایک ارتقائی صورت، کون وجود میں آتی ہے۔ پھر کائنات کی اس متوقع فنا کے بعد کسی اور مکمل تر صورت کے وجود پذیر ہونے میں کون سا استحالہ ہے؟ اگر مردہ زمین، بارش کے دانوں سے زندہ کی جا سکتی ہے اگر بے جان مادہ میں جان ڈالی جا سکتی ہے، تو مردوں کو پھر زندہ کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ تمہیں مر کر دوبارہ زندہ ہونے پر حیرت ہے حالانکہ اس سے بدرجہا زیادہ حیرت انگیز تو تمہارا عدم محض سے وجود میں آنا ہے۔ جب اتنی بڑی حیرت انگیز بات واقع ہو گئی تو اس سے کم درجہ کی بات پر تمہیں کیوں اچنبھا ہوتا ہے؟ تم نے

غلط کہا کہ مر کر جی اٹھنے کا کوئی مشاہدہ آج تک نہیں ہوا۔ زندگی سے خالی مادے میں زندگی کے آثار پیدا ہوتے ہوئے تم روز دیکھتے ہو، اور پھر بھی تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جو مادہ ایک مرتبہ آثارِ حیات قبول کر چکا ہے وہ پھر بھی انہیں قبول کر سکتا ہے۔ اور یہ کون سی عقلیت ہے کہ تم ایک طرف تو اپنے ذی عقل، ذی علم ہونے کا دعویٰ کرتے ہو اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہو کہ تمہیں کسی ایسی بے عقل، بے شعور، بے علم طاقت نے بنایا ہے جو سالہا سال تک تم سے محنت اور عمل کرانے کے بعد یونہی تمہیں اور تمہارے کاموں کو خاک میں ملا دے گی؟ تم اپنی زندگی کے کسی کام کو بے مقصد بے نتیجہ اور عبث نہیں پاتے اور نہیں سمجھتے، مگر حیف ہے تمہاری عقل پر کہ جس زندگی کا ہر ہر جز بامقصد اور نتیجہ خیز ہے، خود وہ زندگی تمہارے نزدیک عبث ہے، بے نتیجہ ہے اور بے مقصد ہے! تمہاری عقل نے تمہیں خود اپنی نگاہوں میں کس قدر ذلیل اور بے قدر کر دیا کہ تم اپنے آپ کو گھاس پھونس اور کنکر پتھر سمجھ بیٹھے!

یہ سن کر جواب کیا ملتا ہے؟ یہی کہ نہ ہم نے اس صانع حکیم کو دیکھا جس کا تم حوالہ دیتے ہو، نہ اس مقصد کا ہمیں نشان ملا جس کے لئے تم کہتے ہو کہ اس نے ہمیں بنایا ہے، اور نہ ہم نے کسی مردے کو زندہ ہوتے دیکھا، اس لئے ہم ان باتوں میں سے کچھ بھی نہیں مانتے، کیونکہ ہم صرف انہی حقیقتوں

کو مانتے ہیں جو لیبارٹیری میں ناپی تولی اور محسوس کی جا سکتی ہیں یہ ہے جاہلیت کی بے بصری۔ ایک طرف اپنی حیوانیت کا پرفخر اعتراف، دوسری طرف حقایق کو بالمشافہ دیکھنے کا مطالبہ! سچ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے مَن لَّم یَجعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُورًا فَمَا لَہٗ مِن نُّورٍ۔

غور کرو خدا اور آخرت کے خلاف دلیل یہ نہیں ہے کہ ان کے عدم وجود پر دلائل کی شہادت موجود ہے، بلکہ دلیل یہ ہے کہ ہمارے حواس نے ان حقایق کو محسوس نہیں کیا۔ کتنا محکم استدلال ہے۔ اگر کل یہ بات تحقیق نہ ہو گئی ہوتی کہ فضائے کائنات میں ہزارہا اجرام تیر رہے ہیں، ہمارے نظام شمسی کے علاوہ بے شمار نظامِ شمسی موجود ہیں، زمین اپنے محور پر گھوم رہی ہے، آفتاب کی شعاعیں انرجی اُگل رہی ہیں، فضائے بسیط ایک لطیف چیز سے بھری ہوتی ہے جسے ایتھر کہتے ہیں، تو آج "حقیقت پرست" جاہلیت پر یہ فرض عائد ہو جاتا کہ پورے جزم و یقین کے ساتھ ان حقایق کا انکار کرے۔ کیا غیبی حقایق کے خلاف چودہ سو برس یا چار ہزار برس پیشتر کی جاہلیت نے اس کے علاوہ کوئی اور دلیل پیش کی تھی اس کی آنکھوں پر بھی تو یہی مادی پردہ تھا، اس نے بھی تو اسلامی تصورات کے قبول کرنے میں اسی تنگ دماغی کا ثبوت دیا تھا۔ جاہلیت جدیدہ کا غلغلۂ الحاد و انکار فلک شگاف اور آفاق گیر سہی مگر بلحاظ اصلیت وہ

بھی تخمین و تخرص کی انہیں تاریک وادیوں میں بھٹک رہی ہے جو اس کے مورث اعلیٰ ترکہ میں چھوڑ گئے ہیں، بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ۔ اور اگر تم الفاظ کی مرغوبیت سے آزاد ہو کر اصل معنی تک پہنچکر دیکھو تو نظر آئے گا کہ وہی سرچشمۂ جاہلیت کا سینچا ہوا نفسانی تخم خبیث ایک جگہ شجر الحاد بن کر نمودار ہوتا ہے تو دوسری جگہ شرک کے برگ و بار نکالتا ہے، ایک جاہل اس بنا پر خدا اور آخرت کا انکار کرتا ہے کہ اس کے نفس کو اباحت (Hico NTIOUSNESS) کی سرورانگیزیوں سے بلا خوفِ انجام محفوظ ہونے کا موقع ملے، اور دوسرا صفاتِ الوہیت کو پتھر کے مجسموں میں اس لئے تقسیم کر دیتا ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی کی بے لاگ سنت الٰہیہ سے دوچار نہ ہونا پڑے، رند کا رند بھی رہے اور ان بتوں کی سفارشوں کی بدولت جنت بھی ہاتھ سے نہ جائے مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى حیوان دونوں ہوئے، چاہے تم ان کے نام الگ الگ ہی کیوں نہ رکھ لو دونوں نفس کے پرستار، دونوں کی محسوس پرست ذہنیت ادراکِ حقیقت سے عاجز و درماندہ، یعنی دونوں کے لئے اسلامی تصورِ الوہیت اور نظریۂ آخرت غیر مانوس، اجنبی، غریب اور قابلِ حیرت و استعجاب۔

جاہلیتِ جدیدہ نے اپنے افکار و نظریات، اپنے علوم و فنون، اپنے اخلاقی تصورات اور اجتماعی اصول، اپنے قوانینِ معاشرت و تمدن، اور اپنی

سیاست و معیشت کی پوری بنیاد خدا اور آخرت کے انکار پر رکھی ہے، اور یہی نظامِ حیات آج تمام دنیا میں فوجی طاقت، معاشی تسلط اور تعلیم کے زور سے پھیلا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں وہ نظامِ حیات اپنی بنیاد سے لے کر اپنے اجزا تک یکسر غریب ہو کر کیسے نہ رہ جائے جس کی اساس ہی خدا اور آخرت کے عقیدہ پر رکھی گئی ہے؟ جاہلیت جتنی سخت آج ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ اس لئے اسلام جتنا غریب آج ہے، اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ دونوں تہذیبوں میں بعد المشرقین ہے۔ اسلامی تہذیب بنی آدم سے گذر کر زمین و آسمان، ثوابت و سیارات، آفتاب و ماہتاب، ابر و باد، شجر و حجر، چرند و پرند یعنی موجوداتِ ہستی کے ایک ایک ذرہ کو مسلم اور ایک عالمگیر مذہب کا پیرو بتاتی ہے۔ لیکن تہذیبِ نو یا تو سرے سے مذہب کا نام ہی نہیں سننا چاہتی اور اگر کچھ رعایت سے کام لیتی ہے تو اسے عبادت گاہ کی چہار دیواریوں میں محصور کر کے حکم دیتی ہے کہ خبردار اس احاطہ سے باہر آواز نہ نکلنے پائے، دنیا کے کسی معاملہ سے تیرا کام نہیں، زندگی کے تمام شعبے تیری مداخلت سے آزاد ہیں، ایک مکمل دستورِ حیات کی حیثیت سے تجھے پوری دنیا پر حکمرانی کرنے کا مجاز نہیں، یہ حق محض معدہ اور نفس کو حاصل ہے، تیری حیثیت محض ایک شخصی اعتقاد کی حد تک گوارا کی جا سکتی ہے۔ عملی زندگی یا اجتماعی معاملات سے تجھے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

زبان تجدد نے یہ فتویٰ غریب مذہب کو سنا تو دیا اور مادی اغراض کے اشارے پر اس نے "علم و سائنس" کی روشنی میں اپنا ایک نظامِ حیات بھی بنا لیا۔ لیکن باطل کوشی کے مہلک نتائج جب سامنے آئے تو اس کی آنکھیں کھلیں اور اسے معلوم ہوا کہ جس چیز کو وہ روشنی سمجھ رہا تھا وہ ایک ہیبتناک تاریکی تھی، اور جس طرف آبِ حیواں سمجھ کر وہ لپکا تھا وہاں سراب کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس تلخ تجربہ نے اسے مذہب کو پھر یاد دلایا اور اس نے ایک ایسے مذہب کی ضرورت محسوس کی جو اپنے اندر ہمہ گیری اور کلیت کی شان رکھتا ہو، اجتماعیت کا رہنما ہو میدان زندگی کے ہر گوشہ میں مشعل بکف ہو انفرادی و اجتماعی ہر قسم کے امراض کا چارہ ساز ہو، حریتِ فکر اور روحِ تحقیق کا علمبردار ہو، قوانینِ فطرت سے ہم آہنگ ہو اور دنیوی کامرانیوں اور دینی ارجمندیوں کا نقیب ہو۔ لیکن چونکہ موجودہ مذاہبِ عالم سے اسے ایک موروثی بغض اور غلط فہمی ہے اس وجہ سے اس کا خیال ہے کہ یہ سارے مذاہبِ مروجہ ناقص ہیں، اور ان مذکورۂ بالا اوصاف کا کوئی حامل نہیں۔ اس نظریہ کی بنا پر اس نے ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کی ٹھانی ہے جس کا نام وہ "دینِ فطرت" رکھتا ہے۔ وادیٔ اضطراب میں وہ یوں سرگرداں پھر رہا ہے مگر جاہلیت کی یہ کیسی کامل ساحری ہے کہ اس کی آنکھوں کو سجھائی نہیں دیتا کہ جس چشمۂ حیات کے

لئے وہ تڑپ رہا ہے وہ صدیوں سے قرآن کے سینے میں محفوظ ہے اس سے بڑھ کر اسلام کی غرابت اور اجنبیت کا منحوس دور اور کونسا ہو سکتا ہے؟

کلیسا سے نکل کر ہندی بت خانوں میں آؤ اور اس کے مہاتماؤں اور شری پتیوں کے سامنے مذہب کے اس اسلامی تخیل کی وسعت، عظمت اور ہمہ گیری پیش کر کے ان کی پیشانیوں کو دیکھو کہ حیرت اور اجنبیت کے شدید احساس سے کس طرح شکن آلود ہو جاتی ہیں۔ ایک شری پت جو اپنی آمدنی پر سالانہ بیس ہزار روپے ٹیکس کے ادا کرتے ہیں اور ساتھ ہی پینتیس کروڑ فاقہ مست ہندوستانی جنتا کے پینتیس کروڑ معدوں کی بھوک پیاس اپنے صرف ایک معدہ میں محسوس کر کے بے تاب ہوئے جا رہے ہیں بعض "مذہبی مجنونوں" کے اس مطالبہ پر کہ مسلمانوں کے تمام اجتماعی مسائل اسلامی نظریات کے مطابق حل ہونے چاہئیں، چین بجبیں ہو جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں تو جنتا کی بھوک، بیکاری اور جہالت کو دور کرنا چاہتا ہوں، یہاں ہندو مت اور مسلم مت کا کیا سوال؟ مذہب کے لئے تم مسجدوں اور مندروں میں بیٹھے رہو، اس کا تعلق تو محض انفرادی عقائد اور معاملات تک ہے، اجتماعی مسائل اور عملی میدان میں تم اس سنگ گراں کو لائے اور آزادی کا نازک آبگینہ چور چور ہوا۔ مذہب کے

دامن کو اتنا نہ پھیلاؤ کہ وہ خانقاہوں کی خاموش فضا سے نکل کر جیل کی شورشوں تک پہنچ جائے، وہی اپنے ہاتھ سے روٹی بانٹے، وہی اپنے حکم سے پارٹی بنائے، وہی الیکشن لڑائے اور وہی اسمبلی ہال میں تقریر بھی کرائے۔ یہ عجیب مذہبیت ہے! میں نے تو اجودھیا سے ماسکو تک چھان مارا ہے، کسی روشن دماغ اور وقت شناس کے نزدیک اُسے درخورِ اعتنا نہیں پاتا۔

شاید تم کہو کہ اس ریمارک میں تو الحاد کی بُو آتی ہے۔ شری بیت بیچارہ مذہب کو کیا سمجھے۔ ہاں جو مذہب اور خدا کو مانتا ہوگا وہ اسلام کے اس تصور سے کہ مذہب ایک خدائی ضابطۂ زندگی ہے جو ہر شعبہ حیات پر حاوی ہے یقیناً بیگانہ نہ ہوگا۔ اچھا چلو کسی ایسے مذہب پرست، خدا رسیدہ کو تلاش کرو جو مہاتما بھی ہو، بھگت بھی ہو، اسے "خدا کی روشنی" بھی ملی ہوئی ہو اور شاید کرشن جی کا اوتار بھی تسلیم کیا جاتا ہو یا کیا جانے والا ہو۔ اور اس سے اس نظریہ کے متعلق یہ سُن لو کہ "تمام مذاہب سچے ہیں" مذہب چند عالمگیر صداقتوں کا نام ہے۔ مجھے اسلام کے نظریہ کے متعلق بڑا خلجان تھا۔ لیکن اب مولانا . . . . کی تفسیر سے تسلی ہوگئی کہ وہ بھی ہر انسان کو ایک خاص ضابطہ اور ہمہ گیر قانون کا پابند نہیں بناتا" مفکرین ہند کے وہ روشن ضمیر جن کی "ہر بات ٹھیک ہوتی ہے" اسلام کو بس قدر سمجھے

ہیں اب تم خود فیصلہ کر لو۔

رہ گیا اسلام کا تصوّر خلافت سو اس کی اخلاقی عظمت اور عقلیت بندگانِ جہل کے احاطۂ تصور میں کیوں کر آئے۔ اسلام تمام بنی نوع انسان کو خدا کی رعایا اور صرف ایک خدا کو حاکم علی الاطلاق مانتا ہے۔ اس کے وضع کردہ قوانین کا نفاذ کرنے والا ہی اس کا نائب اور خلیفہ ہو سکتا ہے جس کا فرض ہے کہ بغیر انسانی رایوں کی آمیزش کے ان قوانین کو نافذ کرے، خدا کی زمین سے شر و فساد کا استیصال کرے، اور عدل و خیر کی برکتوں سے دامن ارض بھر دے۔ اس کا انتخاب نہ تو چہرہ کا رنگ کر سکتا ہے، نہ نسل کا امتیاز۔ استحقاقِ خلافت نہ قومیت ثابت کر سکتی ہے نہ وطنیت، یہ خدا کی ایک مقدس امانت ہے۔ اس کا نشیمن صرف ایک مقدس دل ہی ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ کہیں یہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہ سب کچھ سن کر جاہلیت ایک حقارت آمیز قہقہہ لگاتی اور نگاہ حیرت سے گھورنے لگتی ہے۔ اس کا ذوقِ روشن خیالی ایسے نامعقول اور دقیانوسی تصور سے چیں بجبیں ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے خدائے وطن کی اس تحقیر کو گوارا نہیں کر سکتی۔ پہاڑ کی دیواروں اور پانی کے دھاروں سے تقسیم انسانیت کے حقوق سلب کر لینا اس کے نزدیک ظلم ہے۔ کوئی اپنے وقت کا فاروقؓ اور صدیقؓ سہی، لیکن اگر اس کے پاس نسل کا پروانہ نہیں، وطنیت کا لیبل نہیں، قومیت

کی سند نہیں تو کسی حق کا مستحق نہیں۔ خلافت اور حکومت تو بڑی چیز ہے عام شہری حقوق کا بھی حقدار نہیں۔ جغرافیائی حدود یا نسلی امتیازات، اقوام واوطان بنانے والے ہیں، اقوام واوطان مجالس آئین ساز منتخب کرنے والی ہیں، اور یہ مجالس قوانین وضع کرنے والی ہیں۔ ایک قوم اگر دوسری قوم پر حکومت کر بھی سکتی ہے تو اس لئے نہیں کہ محکوم قوم میں عدل کو زندہ کرے گی، قانونِ الٰہی کو نافذ کرے گی، بھٹکی ہوئی انسانیت کو سچائی اور ہدایت کی روشنی دکھائے گی۔ بلکہ اس لئے کہ وہ سفید فام ہے اور دوسری سیاہ رنگ، یا وہ آریہ نسل سے ہے اور دوسری غیر آرین، یا اس کے ہاتھ میں ہٹلری گرز ہے اور دوسری بے دست و پا ہے۔ چنانچہ جاہلیت کے جدید علمبرداروں نے حق و صداقت کے اس فرعونی تخیل کی شہادت اپنے عمل سے بھی پیش کر دی اور قول سے بھی۔ ابھی کل کی بات ہے جب ہندوستان نے انگریزوں سے للکار کر کہا کہ دیکھو ہمالیہ اور بحر عرب "ہندوستانی حرم کی فصیلیں ہیں، ان کی حرمت کا لحاظ کرکے یہاں سے نکل جاؤ، تو برطانی دار القضا سے پہلے ہٹلر نے فتویٰ دیا "ہرگز نہیں، کالے ہندوستانیوں پر سفید فام اقوام کو حکومت کا فطری حق حاصل ہے"۔ لیکن اس ہنگامہ سوال و جواب میں اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ کے ضابطہ کو ہر ایک نے ناقابل اعتنا سمجھا۔ اسی طرح چند سال پیشتر جب

امتِ اسلامی کی پراگندہ بھیڑوں کو یورپین بھیڑیوں نے چن چن کر پھاڑنا شروع کیا۔ اور غافل مسلمانوں میں رُوحِ خلافت کی ربانی طاقتوں کا دوبارہ احساس پیدا ہوا تو مہذب جاہلیت نے اس کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا اور اسے "پان اسلامزم" کا ہوّا بنا کر امن عالم کی برقراری کے لئے دعائیں کرنے لگی۔ حالانکہ وہ اسلامی خلافت کا محض ایک ہلکا سا پرتو تھا مگر جاہلیت اس کے اتنے سے فروغ کو بھی کیوں برداشت کرتی آخر اس نے اس "خطرہ" کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا اور اسلامی خلافت کا ٹمٹماتا ہوا دیا بھڑک کر بالکل خاموش ہو گیا۔

گو مسلمانوں کی موجودہ عملی سیاست میں اس الٰہی خلافت کے آثار مفقود ہیں اور شاید مدعیانِ اسلام کے دماغوں میں بھی اس کا کوئی نقشِ تمنا موجود نہیں مگر اس کا مجموعۂ قوانین یعنی قرآن ابھی موجود ہے جو زمانہ کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹک رہا ہے اور اگر بس چلے تو طوفانِ جہل انسانی دماغوں سے مٹانے کے بعد ان نقوشِ ہدایت کو کاغذ کے صفحوں سے بھی دھو ڈالے ابھی اس نادان فرنگی کی اس تقریر کی صدائے بازگشت تمہارے کانوں میں گونج رہی ہوگی جس میں اس نے برطانی پارلیمنٹ کے سامنے قرآن ہاتھ میں لے کر کہا تھا "کہ جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود ہے کبھی امن نہیں قائم ہو سکتا۔"

تمہیں حیرت نہ ہو کہ ایک ایسی کتاب کے بارے میں جو عدل کی میزان ہو، اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً کی داعی ہو، وَ تَدْعُوْا اِلَی السَّلْمِ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کی معلم ہو، اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی کی معلن ہو، یہ رائے کیونکر قائم کی جا سکتی ہے جو دانش فروشانِ فرنگ نے قائم کی ہے کہ یہاں تو صلاح و فساد کا معیار ہی اور ہے آنکھ کا اندھا شب و روز کو یکساں تاریک پاتا ہے، لیکن دل کا اندھا صرف دن کو تاریک دیکھنے ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ شبِ تار کی نورانیت کا پُرجوش عقیدت مند بھی ہوتا ہے۔ یہ مملکتِ جہل کا اساسی دستور ہے۔ یہاں عالم الغیب و الشہادہ کا بنایا ہوا قانون موجب فساد اور کوتہ نظر و ظاہر بین انسانوں کا وضع کیا ہوا قانون امن و صلح کا ضامن مانا جاتا ہے۔ پھر یہ تخیل کوئی نیا تخیل نہیں ہے۔ دنیا ہمیشہ سے حیوانی بوالعجبیوں کا گہوارہ ہی ہے۔ عرب کے منافقین نے بھی تو کچھ اسی تخیل کے ماتحت — جب انہیں غیر آسمانی قوانین کے نتیجۂ اتباع یعنی افساد فی الارض سے روکا گیا — کہا تھا کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ پھر آج اسی بات کو انہیں کے بھائی بندوں سے سن کر ہمیں تعجب کیوں ہو یہ تو قَدْ تَشَابَھَتْ قُلُوْبُھُمْ کی خارجی تفسیر ہے۔ جو باتیں پہلے دلوں سے نکلی تھیں وہی اب بھی نکل رہی ہیں۔ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ

مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ - جہالت کا بیج جس زمین میں بویا جائے گا۔ ایک ہی سا پھل لائے گا، اس میں مشرق و مغرب کے بُعد اور ادوار کے اختلاف کا کیا سوال۔ وَکَذٰلِکَ نَسْلُکُہٗ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ کی سنت عامہ کا نفاذ اُن زمانی و مکانی حدود سے آزاد ہے۔

جنگ و جہاد اور صلح و معاہدہ کے متعلق اسلامی تعلیمات کی اخلاقی رفعت، حدود نظر سے آج بھی اسی قدر ماوراء ہے جس قدر قرونِ مظلمہ میں تھی۔ آج کسی مہذب ترین سلطنت سے کہو کہ دشمن سے اس وقت بھی صلح کرنے میں پس و پیش نہ کرو جب وہ مغلوب اور تم غالب ہو۔ امن پسندی اور انسانیت کا تقاضا ہے کہ حریف کو تم خود اس وقت صلح و آشتی کی دعوت دو۔ جب اس کے بازو تھک کر چور ہو چکے ہوں، اس کی جنگی تدبیریں نامراد اور حوصلے پست ہو رہے ہوں، اور فتح و کامرانی ہر طرف سے تمہیں کو ڈھونڈھ رہی ہو۔ پھر جب تم اس سے صلح کر لو اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو جائے تو خبردار مدت معاہدہ ختم ہونے سے پہلے اس کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی نہ کرو، حتیٰ کہ اگر تمہارے عزیزوں، قرابت داروں اور دینی بھائیوں کے خلاف بھی وہ دشمن معاہدہ صف آرا ہو اور معاہدہ ان لوگوں کی حمایت اور مدافعت کرنے کی اجازت نہ دیتا ہو تو تم معاہدہ کی حرمت پر سب کچھ قربان کر دو کہ دنیا کی ساری متاع کھو کر ان

پہ کچھ نہیں کھوتا۔ مگر اخلاق اور انسانیت کھو کر سب کچھ کھو دیتا ہے۔ یہ باتیں سن کر آج اس سطح ارض پر بسنے والی کوئی "متمدن" قوم تمہیں سلیم العقل اور باہوش انسان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ شکست کھانے والا فریق صلح و مسالمۃ کی پیش کش کرے تو کرے لیکن فاتح اور غالب سے یہ توقع کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اونچے سر کا جھکنا کس قدر عجیب بات ہے!

آج تم ہر دنیوی مقصد کے لئے تلوار اٹھا سکتے ہو اور انسانی خون بہا سکتے ہو۔ تمہارے لئے جائز ہے کہ چین کو افیون کھلانے کے لئے فوجیں لے کر چڑھ جاؤ۔ تم اپنی سلطنت کے راستوں کی حفاظت کے لئے جبرالٹر سے ہانگ کانگ تک ہر ملک اور ہر قوم کو غلامی کی زنجیریں پہنانے میں حق بجانب ہو۔ اور اس غرض کے لئے فلسطین کی سرزمین کو لالہ زار بنا سکتے ہو۔ تمہیں اس کا بھی حق ہے کہ خام پیداوار حاصل کرنے اور اپنی تجارت کے لئے نئی منڈیاں تلاش کرنے کے لئے جس ملک پر چاہو حملہ کر دو۔ تم وطن اور قوم اور بادشاہ کے نام پر بھی لڑنے کے حق دار ہو لیکن اگر تم نے خدا کے نام پر تلوار اٹھائی اور زمین میں خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لئے جنگ کی تو تم سے بڑھ کر وحشی، مذہبی دیوانہ، خونخوار درندہ اور کوئی نہیں۔ یہ ہے جاہلیت جدیدہ کا فلسفۂ جنگ۔

آج تم (نعوذ باللہ) خدا کی الوہیت و حاکمیت کا انکار کر دو، جاہلیت تم پر مرحبا و آفرین کے پھول برسائے گی۔ نبوت، وحی اور شریعت کا استخفاف کرو، تہذیب تمہیں مدبر، مفکر، فلسفی اور حکیم کا خطاب دے گی۔ دامن عفت و انسانیت کے پرزے اڑا دو زمانہ تمہیں روشن خیالی کا دیوتا کہہ کر پکارے گا۔ لیکن اگر تم نے وطنیت اور قومیت کے بتوں کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو پھر تم اپنی بخشش کے لئے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔ کفار قریش نے نبی صلعم سے متعجبانہ گلہ کیا تھا کہ اپنی قوم کا خون بہا کر تم کیونکر سرخرو ہو سکتے ہو۔ عبداللہ ابن ابی حیرت سے بے خود اور وفور غیظ سے بے تاب تھا کہ مکے سے آئے ہوئے غیر ملکی ہماری پیڑ ہی قومیت اور وطنیت کی بے حرمتی کر کے کس طرح بھائی کو بھائی سے لڑا رہے ہیں۔ لیکن آج جبکہ علم و حقیقت کی کرنیں دور جاہلیت کی تمام جہالتیں آشکار کر چکی ہیں۔ اور تہذیب زمانہ ہر اس چیز کو جس پر قدامت کا "داغ" لگا ہوا ہے مردود قرار دے کر ان جہالتوں پر مغرورانہ ہنس رہی ہے، آپ کو معلوم ہے کہ داعی اسلام کا سب سے بڑا قصور اور (نعوذ باللہ) وحشیانہ فعل کیا ہے؟ اس کا جواب فرانس کے مشہور ادیب سیاست دان والٹیر کی زبانی سنئے۔ نہایت متعجب ہو کر کہتا ہے۔

"سیل وغیرہ کو آخر عرب کے اس شتربان (روحی فداہ)

میں عظمت کا کونسا پہلو نظر آیا؟ قوم نے اسے سردار منتخب کیا ہوتا یا اپنے ملک اور وطن کی حمایت میں اس نے اغیار سے جنگ کی ہوتی تو خیر ایک بات بھی تھی لیکن جو شخص خدا کے نام کو آڑ بنا کر خود اپنے ملک والوں سے جنگ کرے اسے کوئی اچھا کس طرح کہے۔"

"نئی روشنی" اور پرانی "جہالت" کا موازنہ کر کے نتیجہ نکال لیجئے۔ زمانہ کے موجودہ نظام معاشرت کو دیکھتے ہوئے ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ اسلام کے معاشرتی نظریات اور تصورات سے کس قدر متوحش اور بیگانہ ہوگا۔ سوسائٹی کا اسلامی نظام عفت، عصمت، حیا، پاکیزگی اور اخلاق کی بنیادوں پر رکھا گیا ہے۔ مرد و عورت کے فرائض ان کی فطری خصوصیات کے مطابق الگ الگ متعین کئے گئے ہیں، کیونکہ ان میں سے ایک سراپا فعل ہے دوسرا مجسم انفعال۔ گویا یہ دونوں صنفیں ایک گاڑی کے دو پہئے ہیں جو ایک خاص تعامل کے ذریعہ نظام انسانی کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ مرد کو اس گاڑی کا نگران بنایا گیا ہے۔ انسانی ترقی کا راز انہیں دو قوتوں کے باہمی تعاون اور فرائض خصوصی کے امتیاز پر منحصر ہے۔ اسی بنیادی تخیل کے ماتحت نکاح، طلاق، پردہ، تعدد ازدواج وغیرہ کے احکام قرآن نے بنی نوع انسان کو دئے ہیں، جن کے اندر انسان کی تمام فطری

مصلحتوں کا نہایت حکیمانہ انداز میں لحاظ رکھ کر انسانیت کو ہمیشہ
کے لئے حیوانیت کی دست بُرد اور نفسانیت کی ریشہ دوانیوں سے
محفوظ کر دیا گیا ہے۔ لیکن جاہلیتِ جدیدہ ان حکمتوں کو سمجھنے کے لئے
کب تیار ہے۔ وہ تو ان تمام قیود کو دورِ وحشت کی یادگار بتاتی ہے اور
انصاف و مساوات کے نام پر عورت کو "ترقی کے میدان" میں لا کھڑا
کرتی ہے۔ ایک طرف مرد و عورت کے خلقی فرق کو بھی تسلیم کرتی ہے،
دوسری طرف انہیں ایک ہی اسٹیج پر بھی رکھ رہی ہے۔ نکاح اور پردے
کی قید کو انسانیت کی توہین بتلاتی ہے، اور عورت کے تمام فطری امتیازات
کو اٹھا کر، مرد کو قوامیت سے معزول کر کے، آزادیٔ نسواں کا وعظ کہہ کر،
اباحت اور ہوس رانی کا وہ مہیب جہنم زار بنا رہی ہے جس میں آج
سارا عالم انسانیت جل جل کر خاکستر ہو رہا ہے۔ اور جاہلیت کی سحر آفرینی
ملاحظہ ہو کہ عصمت و اخلاق اس کے نزدیک محض بے معنی الفاظ ہیں۔
آج تجدد اور روشن خیالی کی دنیا میں بھائی بہن کے درمیان حرمت کے
پردے نہ صرف عملاً بلکہ اعتقاداً بھی اٹھ چکے ہیں۔ آزاد محبت (Free
Love) اس کے صنفی تعلقات کا اصل الاصول ہے۔ اس کا اعلان
ہے کہ "بیوی سب کی بیوی اور شوہر سب کا شوہر ہے" اور جس لڑکی پر
کسی نوجوان کی نظر انتخاب پڑے وہ بلا حیل و حجت اپنے آپ کو اس کے

سپرد کردے۔" اس کا خیال ہے کہ نفس کی تسکین کا ہر ممکن ذریعہ انسان کے لئے ذریعہ سعادت ہے۔ ایک روسی مصنف اپنے ایک ناول میں لکھتا ہے

"شراب خوری اور زنا کوئی قابل شرم چیزیں نہیں ہیں۔ گناہ کوئی چیز نہیں۔ محبت کرنا، خوب پینا اور عورت کا تعاقب کرنا خاصۂ مردانگی ہے، ایک فطری جذبہ ہے اور فطری جذبہ گناہ نہیں ہو سکتا۔"

لیکن یہ نہ سمجھو کہ جاہلیت کے کمال ارجمندی کا یہ سب سے اعلیٰ شاہکار ہے نہیں، اور آگے چلو۔ اور علم و تمدن کے عین مرکز میں پہنچکر اس صنفی انارکی اور اخلاق و انسانیت کی تباہی کا اندازہ کرو۔ اسی بیسویں صدی کی تیسری دہائی کا واقعہ ہے کہ جرمنی کا ایک فاضل ڈاکٹر ہرشفلد (Dr. Hirschfeld) اس نظریہ کی حمایت کے لئے اٹھا جس پر آج سے چار ہزار برس پہلے حضرت لوط کی قوم عمل پیرا تھی، اور اس نے چند سال کی مسلسل تبلیغ سے رائے عام کو اپنا ہم نوا بنا لیا، یہاں تک کہ جرمن پارلیمنٹ میں کثرت آراء سے عمل قوم لوط ایک جائز قانونی فعل بن گیا۔ چار ہزار برس کی ترقی سے پرانی جاہلیت اور نئی جاہلیت میں اگر کوئی فرق ہوا تو وہ صرف اس قدر تھا کہ حضرت لوط کی قوم عام لائسنس کی قائل تھی، مگر جرمن پارلیمنٹ نے اس کام کیلئے یہ شرط لگانی ضروری سمجھی کہ فاعل و مفعول کے درمیان عمر کا تناسب ملحوظ رکھا

جائے، اور غیر فطری تعلقات قائم کرنے سے پہلے مفعول کے والدین سے اجازت لے لی جائے!

آج کل دنیا کا سب سے مشکل مسئلہ معاش کا ہے۔ اقوام متمدنہ کی اکثر علمی و فکری صلاحیتیں اسی پیٹ کی چاکری میں لگی ہوتی ہیں اور قریب تمام مسائل حاضرہ اسی محور کے اردگرد گھوم رہے ہیں۔ لیکن انسانی فکر و نظر کی یہ کتنی عبرتناک کوتاہی ہے کہ وہ اپنی پیہم کوششوں کے باوجود اپنے اس تنہا مقصدِ حیات کی گتھی اب تک نہ سلجھا سکی۔ اور آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جس انسان کو خدا کے نام پر اکٹھا ہونے کا حکم دیا گیا تھا وہ روٹی کے نام پر امتیں بنا رہا ہے، معاشی طبقات کے درمیان جنگ کا صور پھونک رہا ہے و یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیَقْدِرُ کی حکیمانہ سنت ربانی کو باطل کرنے پر تلا ہوا ہے، اور اس طرح اپنی معاشی ابتری اور اجتماعی بدحالی کی جڑوں کو اپنی نادانی کی وجہ سے اور زیادہ پانی دیئے چلا جاتا ہے۔ اسلام تحریم ربٰو اور فرضیت زکوٰۃ کا اعلیٰ اور عادلانہ نظام پیش کر کے ان تمام مصائب اور مشکلات رزق کا بہترین حل بتا چکا ہے، جنہوں نے عقل جدید کو حیرانی میں ڈال رکھا ہے۔ مگر یہ عقل جدید! اس کو جاہلیت کی غلامی نے ایسا اندھا بنا دیا ہے کہ اسے بے روزگاری، معاشی کساد بازاری (Economic Depression) ہڑتالیں، ہنگامے، کشت و خون انقلابی

بحران، اشتراکی انقلاب، مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ، سوسائٹی کے نظام کی برہمی، اخلاقی انحطاط، اباحت مطلقہ اور حیوانی بے قیدی، سب کچھ قبول، مگر یہ قاعدہ کلیہ قبول نہیں کہ سود حیات اجتماعی کے لئے بدترین لعنت ہے اور زکوٰۃ ہی میں انسانی جماعت کے لئے حقیقی فلاح ہے۔ یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ کی فطری صداقت جس طرح ۱۳ سو برس پہلے عرب کے جاہل بدو کی سمجھ میں نہ آتی تھی، اسی طرح آج بیسویں صدی میں بھی وہ معاشیات کے ایک ڈاکٹر کی کھوپڑی میں نہیں اترتی۔ یہ بھی اسی چکر میں پھنسا ہوا ہے جس میں عرب کا جاہل سود خوار پھنسا ہوا تھا کہ اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا اس کا دماغ بھی اس وسیع نظریہ کے لئے اپنے اندر کوئی سمائی نہیں رکھتا کہ سود سے انسان کی اجتماعی دولت گھٹتی ہے اور زکوٰۃ سے ترقی کرتی ہے۔

معاش کے بارے میں جاہلیت جدیدہ کو ایک اور نظریہ اپنے اسلاف سے ملا ہے۔ عرب کا وحشی بدو اپنی اولاد کو کمی رزق کے خوف سے قتل کر ڈالتا تھا۔ آج نئی روشنی اور تہذیب کا امام بھی یہی کر رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اس جہالت کو، علم و فلسفہ کے لباس میں لپیٹ کر دنیا کی مسحور نگاہوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اور دنیا اس کو بدو کہنے کے بجائے ڈاکٹر کہتی ہے۔ بدو اور ان پڑھ انسان نے یہی جرم کیا تو تہذیب حاضرہ کی زبان

کا حوصلہ بڑھتے بڑھتے خشک ہو گئی اور اس کی یہ جاہلانہ حرکت "قتل اولاد" کہلائی۔ لیکن جب وہی جاہلانہ تخیل خود اس نے پیش کیا تو تمدن کا ذوق ارتقا اس پر عش عش کرنے لگا۔ اور اس بربریت کا نام "برتھ کنٹرول" رکھ دیا گیا۔ یورپ تو یورپ اب ہندوستانی حریت کے ٹھیکیداروں کو بھی آبادیِ ہند کی روزافزوں کثرت سے فکر دامنگیر ہو گئی ہے اور وہ بھی اپنے استادوں کی پیروی میں خدا کی رزاقیت کا درد اپنے سر میں محسوس کرنے لگے ہیں کس کی ہمت ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ کی غریب صدا ان کے کانوں تک پہنچائے؟ اور آخر کس توقع پر؟

تہذیب جدید کے بنیادی اصول کا یہ ایک سرسری خاکہ ہے۔ تم اگر چاہو تو اپنی نگاہِ تصور میں اس اجمالی داستانِ حقیقت کو اور پھیلا لو اور بیک نظر اس نظامِ تہذیب کے ایک ایک خط و خال کو دیکھ لو جو سیف و قلم کی متحدہ حمایت کے زیر سایہ بسیطِ ارض پر چھایا ہوا ہے۔ کیا تمہیں ——بشرطیکہ تمہاری نگاہ مرعوب نہ ہو—— اس پورے خاکہ میں جاہلیت کے نقوش کے علاوہ کچھ اور نظر آسکتا ہے؟ لیکن ہاں غلطی ہوگی اگر جاہلیت حاضرہ کو کسی قدیم جاہلیت کے ساتھ مشابہت دی جائے، یا اس بیسویں صدی میں اسلام کو صرف اتنا ہی غریب کہا جائے جتنا وہ تاریخ عالم کے

کسی پچھلے دور میں تھا۔ آج کا معرکۂ اسلام و جاہلیت صرف یہی نہیں کہ ساڑھے تیرہ سو برس کے قدیم تاریخی صفحات کو دُہرا رہا ہے۔ بلکہ اُس "روشنی" کے دَور میں وہ تمام تاریکیاں جمع ہو گئیں ہیں جنہیں نفس کی شیطانی قوت ابتدائے آفرینش سے ابتک پیدا کر سکی ہے آج حق و باطل کے موجودہ تصادم میں باطل کے پیکر پر وہ تمام اسلحہ سجے ہوئے ہیں جنہیں نئی اور پرانی تمام جاہلیتیں مل کر ایجاد کر سکی ہیں۔ فرعون کا افساد فی الارض، قوم ثمود کا علو و استکبار اہل مدین کا تجارتی و کاروباری مکر و فریب، قوم لوطؑ کا فاحشہ، قوم شعیب کا مذہبی تصور انفرادیت، کفار عرب کا نظریۂ حیات، غرض کونسی جاہلیت ہے جو اس دَور میں موجود نہیں اور اسلام کا کونسا پہلو ہے جس کی غرابت میں شک کیا جائے۔

دوسروں کے نقطۂ ہائے نظر کا جائزہ تو لے چکے۔ آیئے ذرا اب اپنے جیب و دامن کو بھی ٹٹولیں کیونکہ یہ تلخ داستان نامکمل رہیگی اگر اس کے اس سب سے زیادہ دردناک پہلو کا ذکر نہ کیا جائے جو ہم اسلام کے نام لیواؤں کی بدولت نمایاں ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ حقیقت نہایت ہی جانگداز ہے لیکن ہے حقیقت اور حقیقت کا وجود ہمارے آپ کے انکار سے معدوم نہیں ہو سکتا۔ اغیار کی مادہ پرست اور جہل آشنا نگاہیں اگر اسلام کے روحانی حسن اور عقلی جمال کو نہیں دیکھ پاتیں تو اس کا گلہ

ہی کیا کہ وہ تو ہیں ہی کور ذوق اور نامحرم ہاں ماتم اگر ہے تو اپنوں اور یگانوں کا۔ ہمیں غیر مسلموں کو یہ طعنہ دینے کا کیا حق کہ اسلام جیسا عقلی اور فطری مذہب ان کی نظروں میں "غریب" دکھائی دے رہا ہے جبکہ خود پیروانِ اسلام کے اقوال و افعال سے اس کی غرابت کا دن رات ثبوت بہم پہنچ رہا ہے۔ اور یہ لازمی نتیجہ ہے مسلمانوں کے اس سیاسی اختلال اور فکری جمود کا جس کی طرف ہم کہیں اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ دنیا کی زمام قیادت جب قرآنی تہذیب کے ہاتھوں سے نکل کر جاہلیت اور مادیت کے ہاتھوں میں چلی گئی تو فطرۃً مسلمانوں کی فعال ذہنیت شکوہ جاہلیت سے مرعوب و متاثر ہونے لگی اور اس مریض جسم کی طرح جو اپنی قوت کھو کر ہر بیماری کو قبول کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، پیکر اسلامی جاہلی امراض کا آماجگاہ بن گیا۔ اس کے منفعل قویٰ جاہلی اوہام اور غیر اسلامی افکار و تصورات کے سانچے میں ڈھلنے لگے خواہ ان کا تعلق قدیم جاہلیتِ عرب و ہند سے ہو یا جدید جاہلیت روم و فرنگ سے۔

توحید و معاد کے نظریات کا وجود کیا مشرکین عرب میں نہ تھا؟ دیگر اقوام ضالہ اس اعتقاد سے خالی تھیں؟ لیکن پھر بھی قرآن نے انہیں خدا اور یوم آخر کا منکر کیوں کہا؟ بات صرف اتنی ہی تو تھی کہ ان کا اقرار انکار کے ہم معنی تھا۔ وہ زمین و آسمان کا خالق اور حاکم علی

الاطلاق تو خدا ہی کو مانتے تھے لیکن نگاہ میں پستی اور تنگی تھی، اسلئے اسکی قدرت عظمت اور کبریائی کا معیار دنیوی سلاطین کے اقتدار کو ٹھیراتے تھے وہ دیکھتے کہ دنیا کے عام بادشاہوں کے دربار میں تقرب، حاصل کرنے کا واحد ذریعہ امرائے دربار اور اعیان حکومت کی رضاجوئی ہوا کرتا ہے اور مراحم خسروی کا طالب پہلا سجدہ انہیں درباریوں کو کرتا ہے۔ اس پر قیاس کر کے ان تنگ نظر جاہلوں نے تصور الوہیت کو بھی بشریت کا نقاب اڑھا دیا اور ہر پیر اور ولی کو اس کا درباری مان کر پوجنا شروع کر دیا کہ خدا کے دربار میں یہ ہماری شفاعت کرینگے مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ان کے مشرکانہ تخیل کا سنگ بنیاد تھا۔ ظاہر ہے کہ اس تخیل کے ماتحت توحید اور قیامت کے عقائد بلحاظ نتائج بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے جاہلانہ تخیلات مختلف بھیسوں میں انسانی دماغوں پر چھائے ہوئے تھے۔ کوئی اوتار اور حلول کے وہم میں گرفتار تھا۔ کوئی (معاذ اللہ) خدا کی بیوی بچوں کی پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی اس کے بیٹے کے خون سے اپنے اعمالنامے کی سیاہی دھو کر بے فکر بیٹھا تھا۔ کوئی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ کے خواب گراں میں مست انگڑائیاں لے رہا تھا۔ جاہلیت کی ایک روح نہ معلوم کتنے قالبوں میں چھپی ہوئی زمین کے دامن پر اپنے قدم جمائے بیٹھی تھی کہ قرآن کی صدائے غریب نے ان سب

خیالات کی تکفیر و تضلیل کر کے الوہیت اور قیامت کا وہ عقلی اور ٹھیٹھ فطری نظریہ پیش کیا جس کی تفصیل قرآن کے صفحوں میں اب بھی اسی طرح محفوظ ہے جس طرح عہد رسالت میں تھی۔ مگر بتائیے تو سہی آج اہل قرآن کے ذہنوں میں بھی ان بلند حقایق کا وہی نقشہ موجود ہے جو خیر القرون میں تھا۔ پتھر کے مجسّموں کا پجاری گمراہ تھا۔ جاہل تھا، کج فطرت اور طاغوت پرست تھا، مگر یہ مزاروں پر پیشانیاں رگڑنے والا، یہ اہل قبور سے حاجتیں مانگنے والا۔ اور یہ "یا حضرت فلاں" کی جے لگانے والا مسلمان کتنا راست کیش، کتنا سلیم الفطرت اور کتنا وسیع الدماغ ہے؟ عرب کا جاہل شفاعت اور تقرب کی خاطر غیر اللہ کو پوج کر اگر بندہ جاہلیت کہلایا تو انہیں تاویلوں کے ساتھ رسول پرست، ولی پرست، امام پرست اور پیر پرست مدعیانِ اسلام کو کس کا بندہ کہا جائے؟

انبیاء کے متعلق جاہلیت کا مستقل نظریہ یہ رہا ہے کہ بشر خدا کا رسول نہیں ہو سکتا۔ اور اس جاہلی نظریہ نے خدا کے ہر نبی پر دو طریقوں سے حملہ کیا ہے۔ جب کوئی نبی مبعوث ہوا تو اس پر پہلا حملہ اس شکل میں کیا گیا کہ "تم بشر ہو اور بشر خدا کا رسول نہیں ہو سکتا، اس لئے تم رسول نہیں ہو"۔ پھر جب نبی اپنے کارناموں کی دھاک بٹھا کر دنیا سے رخصت ہو گیا تو جاہلیت نے پینترا بدل کر دوسرا حملہ اس طرح کیا کہ "وہ چونکہ

رسول تھا اور بشر خدا کا رسول نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا وہ بشر نہ تھا"۔ یہود نے اسی طریقہ سے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا اور نصاریٰ نے اسی ہتھیار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حملہ کر کے انہیں ابن اللہ بلکہ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ کے مقام تک پہنچا دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جاہلیت کا پہلا اعتراض یہی تھا کہ بشر خدا کا رسول کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس اعتراض کے جواب میں خداوند عالم نے بار بار اصرار فرمایا کہ رسول جب ہوگا بشر ہی ہوگا۔ لیکن آج ہمارے علم و معرفت کے مناروں سے صدا بلند ہوتی ہے کہ ہاں بشر خدا کا تو ہو سکتا ہے مگر خدا کا آخری رسول بشر نہیں تھا۔ اور آنحضرت صلعم کو جو بشر کہے وہ مسلمان نہیں۔ اس صدا پر قرآن کی روح مضطرب ہو تو ہو لیکن مگر جاہلیت کی روح اپنی دیرینہ تمنا سے ہم آغوش تو ہو گئی۔

قرآن نے جب ہمیں منکرین اسلام کا یہ عجیب نظریہ بتایا کہ ہدایت کا معیار صرف دنیوی وجاہت اور تمکن فی الارض ہے تو ہم متحیر تھے کہ انسان اتنا پست نظر اور نادان بھی ہوتا ہے! مگر قدرت نے اعجاز مادیت کی یہ تصویر آج واقعیت کے پردے پر دکھلا دی، چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارا ایک حکیم امت علی الاعلان اسی نظریہ کو پیش کر رہا ہے۔ اس کے نزدیک ملحد فرنگی اللہ کا خلیفہ اور اس کا محبوب ہے، ہدایت یافتہ اور حق پرست ہے، محض اس وجہ سے کہ اس کے پاس مال و زر ہے، تاج و تخت ہے، دنیوی

اقتدار اور مادّی قوت ہے، اور اسے تمکن فی الارض حاصل ہے لیکن مسلمان بے دین ہے، باطل پرست ہے، ہدایت نا آشنا ہے، خدا کا مغضوب اور نافرمان ہے، کیونکہ وہ مفلس ہے، قلاش ہے، غلام ہے، محکوم ہے، کمزور اور ضعیف ہے۔ کوئی شخص اگرچہ کتنا ہی پاک طینت اور متقی سہی مگر برسرِ ہدایت ہونے کے لئے سند میں جو چیز پیش کی جا سکتی ہے وہ طور کی روشنی اور فاران کی تجلی نہیں ہے بلکہ فرعون کا تاج و تخت اور ابولہب کا مال و زر ہے۔ یہ حکیم وقت جب بے نوا مسلمانوں کو دیکھتا ہے تو آقائے فرنگ کی زبان سے وہی کہتا ہے جو عرب کے جاہلوں نے ۱۳۵۰ برس پیشتر کہا تھا کہ

أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ؟

اسی طرح جاہلیت اولیٰ کی جن مردہ سنتوں کو مسلمانوں نے زندہ کر کے اپنے نظامِ مذہب میں داخل کر لیا ہے۔ ان میں سے ایک سنت ظاہر پرستی اور آباء پرستی کی ہے، جس سے قدرتاً فرقہ پرستی پیدا ہوئی، قدیم جاہلیت میں قرآن کی ہر سچائی اس لئے ناقابلِ قبول تھی کہ اہلِ عرب کے آباؤ اجداد سے وہ منقول نہ تھی۔ جو لایعنی رسوم باپ دادا کی وراثت میں ملی تھیں۔ وہی اصل دین سمجھی جاتی تھیں۔ ہر ایک اپنی رسموں کو دانت سے پکڑے ہوئے تھا۔ انہیں کو سچائی اور ہدایت سمجھے بیٹھا تھا، اپنے کو سچا اور تمام دوسرے گروہوں

کو گمراہ یقین کرتا تھا۔ وَكُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ میں ان کی اسی جہالت کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے ہاں اصل چیز مظاہر تھے معانی سے انہیں کوئی بحث نہ تھی۔ مظاہر کی کسی تبدیلی کو دین کی موت خیال کرتے۔ تحویل قبلہ کے وقت اس جاہلانہ ذہنیت نے جو ہنگامہ بپا کیا اس سے کون ناواقف ہے؟۔ آج کی جاہلیت میں وہی ٹرجڈی پھر دہرائی جا رہی ہے۔ اسلام کے پیرو اسی رسم پرستی اور فرقہ پروری پر جھینٹ بنا رہے ہیں۔ وحدت اسلامی اسی آباء پرستی پر قربان کی جا رہی ہے۔ اکابر کے اقوال و اعمال معیار صداقت قرار پا رہے ہیں۔ دین کی رگ جان پر چھری چل جائے تو کچھ نہیں بگڑتا مگر مظاہر کی ادنی سی تبدیلی میں اسلام کی ہلاکت اور ایمان کا زیاں بتلایا جا رہا ہے۔ ہر نئی یا غیر چیز جو کتاب آباد میں موجود نہیں، باطل اور ضلالت ٹھیرائی جا رہی ہے۔ نیکی اور تقوی کو کوئی نہیں پوچھتا مگر ظواہر کی حفاظت میں —— خواہ وہ نماز میں ہاتھ اٹھانے اور نہ اٹھانے ہی تک کیوں نہ محدود ہو —— خون مسلم تک کی حرمت پامال کر دی جاتی ہے کوئی ایک جماعت نہیں جو اس جہل میں مبتلا ہو۔ پوری امت اسی كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ کی لعنت اوڑھے ہوئے ہے۔ اور کوئی نہیں جو خدا کے بندوں کا ماتھا جاہلیت کے آستانہ سے اٹھا دے۔

مذہب کی وہ حقیقت بھی جو مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ کے ذریعہ بتلائی گئی تھی اسی تنگ نظری اور جاہلی تصور مذہب سے دوچار ہے جس نے ابتدائے اسلام میں اس سے ٹکر لی تھی۔ اسلام نے جب مذہب کو رسوم کے نرغے اور معبد کے گھیرے سے نکال کر سیاست، حکومت، معاشرت، معیشت، خانگی تعلقات، انفرادی اعمال اور اجتماعی افکار و معاملات تک پھیلا دیا تو انسان اس وسعت و ہمہ گیری کے خلاف بغاوت کر بیٹھا۔ کیونکہ اس طرح اباحت نفسانی کے تمام دروازے بند ہوئے جا رہے تھے۔ بعینہ یہی نفسیاتی رکاوٹ آج ہم مسلمانوں کو درپیش ہے۔ اس وقت جاہلیت نے زندگی کا جو میدان دنیا کے سامنے تیار کر رکھا ہے اس میں دوسروں سے بازی لے جانے میں اسلام کا یہی نظریۂ مذہب سخت رکاوٹ پیدا کر رہا ہے، لہذا مسلمانوں نے نہ صرف تجدد کے بالاخانوں پر بلکہ خانقاہ کے تاریک حجروں میں بھی مذہب کا مثلہ کرنا شروع کر دیا۔ عرصۂ حیات کے ایک ایک گوشہ سے مذہب کے دامن کو سمیٹا جا رہا ہے اور بوالعجبی دیکھیے کہ اسلام کی عالمگیری کے ادعا ہی سے اس کی عالمگیری کی نفی کی جا رہی ہے۔ اس فریب یا خود فریبی کو چھپانے کے لیے کہیں "عالمگیر صداقت" کا خوشنما نقاب تیار کیا گیا ہے۔ اور ارشاد ہوتا ہے کہ "اسلام چند عالمگیر سچائیوں کا نام ہے۔ اسے مٹنے کا کوئی خطرہ

نہیں، وہ ہر قالب میں زندہ رہ سکتا ہے"۔ اور کسی طرف سے یہ حکیمانہ آواز آتی ہے کہ مذہب کو دنیوی معاملات کے ہر شعبے پر حاوی کرنا اس کے عالمگیر ہونے کا انکار کرنا ہے"۔ مغرب زدہ مسلمان ابھی صرف اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ "سیاست اور معاشرت وغیرہ کو مذہب سے کیا تعلق"، کہ معارف پرور ائمہ دین نے اعلان کر دیا کہ "نہ صرف یہی بلکہ ایمان بالرسالت بھی چنداں ضروری نہیں"۔ پھر اسی کوتہ نظری نے ہم ہی مسلمانوں سے یہ کہلا کر اسلام کا کوئی مخصوص تہذیب و تمدن نہیں، حدیث کا انکار کرایا، تاکہ قرآن کے اصول کو جس طرح چاہیں توڑ مروڑ کر جاہلیت کے قالب میں ڈھال لیں، اور جب نوجوان مسلمان اشتراکیت کے فریب میں آکر کارل مارکس کا کلمہ پڑھنے لگیں تو یہ کہنے میں باک نہ ہو کہ "خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں کا مستقبل روشن ہے کیونکہ مسلم نوجوان اشتراکیت کی طرف آ رہے ہیں"!

یہ اور اسی قسم صدہا آوازیں اسلام کے نام سے بلند ہو رہی ہیں، اسی اسلام کے نام سے جو ایک جزوی مسئلہ قصاص بیان کر کے کہتا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ہاتھ کے بدلے ہاتھ کاٹنے کا حکم نہ ماننا اسلام کی نگاہ میں فسق ہے مگر اسلام کے ہر عضو کی قطع و برید پر ایک نئی خوشی محسوس کرنا اہل اسلام کے نزدیک سب سے بڑی ملی خیر خواہی ہے!۔

اس غیر اسلامی تصورِ مذہب کے مہلک جراثیم نے ہماری خانقاہوں میں ایک اور ہی مگر اسی نوعیت کا مرض پیدا کر رکھا ہے۔ وہاں سارا دین نماز روزے اور ذکر و مراقبہ تک محدود ہے۔ روحانیت کے ان آئینہ خانوں میں جدھر دیکھیے چند مخصوص عبادتوں کی تصویریں نظر آئیں گی کسی سیاسی، معاشی، معاشرتی یا تمدنی معاملہ کا ذکر ہوا کہ تلہیت کی پیشانی شکن آلود ہوئی۔ ان کے نزدیک یہ سب دنیا داری کی باتیں ہیں دین داری یہ ہے کہ دنیا اور اس کے معاملات کو کفار و فاسقین کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے۔ اور اللہ والا مسلمان ایک گوشے میں بیٹھا ہوا بس تسبیح و تہلیل اور ذکر و شغل کرتا ہے۔ اس کے حجرے سے باہر ساری دنیا پر طاغوت کی حکومت قائم ہو جائے تو کچھ حرج نہیں۔ خدا کی شریعت کے بجائے شیطانی قوانین پر انسانی تمدن کی بنا رکھ دی جائے، حرام حلال ہو اور حلال حرام ہو کر رہ جائے۔ اخلاق کے معیار الٹ جائیں اور عدل و تقویٰ ایک لفظ بے معنی بن جائے ہمارے اس دین دار بزرگ کو اس سے کچھ بحث نہیں۔ وہ تو اللہ والا ہے اس کو ان جھگڑوں سے کیا سروکار؟ اس کا کام تو اللہ کی عبادت کرتا ہے، اور اللہ کی عبادت یہ ہے کہ اوراد اور وظائف اور نوافل اور مراقبہ اور حلقۂ ذکر میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کیا جائے — دین داری کے اس راہبانہ تصور نے

اسلام کی رُوح کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ ذکر، عبادت، صبر، توکل، تقویٰ، عمل، مجاہدہ، غرض تمام اسلامی الفاظ کے معنی الٹ گئے ہیں۔ اب خالص بے عملی کا نام "عمل" ہے، اور عمل اب کرنے کی چیز نہیں بلکہ پڑھنے کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ ذکر کے معنی اب یہ ہیں کہ تسبیح چلے، ہونٹ ہلیں اور رات دن میں ہزاروں لاکھوں مرتبہ اللہ کا نام زبان پر جاری ہو۔ باقی رہا وہ ذکر جس کی طرف فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ[1]۔ میں اشارہ کیا گیا ہے تو اس کا تصور تک دماغوں سے

---

[1] یہ آیت سورہ جمعہ میں آئی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ "جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اپنے کاروبار میں اللہ کا فضل (رزق حلال) تلاش کرو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو"۔ یہاں اللہ کو یاد کرنے کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ دنیوی کاروبار کے ہنگامے میں اللہ کے حدود اور شریعت الٰہی کے احکام کا خیال رکھو۔ جہاں قدم قدم پر شیطانی وسوسے اور خواہشات نفس کے تقاضے سامنے آتے ہیں، جہاں جھوٹ اور خیانت، اور حرام خوری اور بدنظری کے بے شمار مواقع پیش آتے ہیں اور شیطان ان کے اندر فائدے کی صورت دکھاتا ہے وہاں تمہیں یاد رہے کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے اور ایک دن تمہیں اسکی عدالت میں حاضر ہونا ہے، ہر مرتبہ جب حرام اپنی ظاہری منفعتوں اور لذتوں کے ساتھ اور حلال اپنے ظاہری نقصانات اور تکلیفوں کے ساتھ دوش بدوش تمہارے سامنے آئیں تو خدا کا خوف تمہیں حرام کو چھوڑنے اور حلال کو اختیار کرنے پر آمادہ کر دے۔ یہ ہے اصل یادِ الٰہی، اور اس میں مجاہدہ، صبر، توکل، تقویٰ سب شامل ہیں۔

نکل چکا ہے، اور اسے اب عین دنیا داری سمجھا جاتا ہے۔ عبادت کے معنی اب چند مخصوص اعمال کے ہیں، اور ان اعمال کی بھی روح کے نہیں بلکہ محض ظاہری شکل کے۔ اگر کوئی شخص صرف فرائض ادا کرتا ہو اور اس کے بعد اپنا سارا وقت کفر و جاہلیت کی طاقتوں کے خلاف جنگ کرنے اور اسلام کی سربلندی کے لئے کوشش کرنے میں صرف کرے تو وہ عبادت گذار نہیں بلکہ دنیا دار ہے، کیونکہ وہ مسجد کے بجائے دفتر میں بیٹھا ہوتا ہے، رکوع و سجود کے بجائے قلم و کاغذ کے کام میں مشغول نظر آتا ہے، اور عبادت کی اس صورت سے ہمارے دین دار لوگ قطعی ناآشنا ہیں۔ ان کے نزدیک عبادت صرف وہ شخص کرتا ہے جو فرائض کے ساتھ تہجد اور اشراق اور چاشت کی نمازیں بھی پڑھے، تسبیح کے دانوں کو بھی گردش دے اور الّا باللہ کی ضربیں بھی لگائے۔

تصورات کا انقلاب بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ جو سیدھا سادہ مسلمان فرائض ادا کرنے کے بعد رزق حلال کمانے اور اپنے حق داروں کے حقوق ادا کرنے میں لگا رہتا ہے وہ تو دنیا کا کتا ہے، اور جو بزرگ اللہ والے بنکر خانقاہ میں سب و روز مشغول عبادت رہتے ہیں اور لگی بندھی فیس لے کر لوگوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں، یا تعویذ گنڈوں کی قیمت وصول کرتے ہیں، یا وعظ کہنے کے لئے آمد و رفت کا کرایہ اور نذرانہ طلب فرماتے ہیں وہ کمال درجہ کے دین دار ہیں!۔

خانقاہوں سے گذر کر مدرسوں کی طرف آیئے تو یہاں جاہلیت کی کارفرمائی ایک دوسرے ہی رنگ میں نظر آتی ہے۔ یہاں ظاہر پرستی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ اسلام ان کے نزدیک ایک محسوس اور مرئی چیز ہے جس کو ناپا اور تولا جا سکتا ہے۔ انہوں نے مسلمان کا ایک پیمانہ بنا رکھا ہے۔ جہاں کوئی شخص سامنے آیا اور انہوں نے فوراً اپنا پیمانہ اس پر رکھ کر ناپ لیا۔ اگر وہ پیمائش میں پورا اترا تو اسے تشرع اور دین داری کا سرٹیفکیٹ دے دیا گیا۔ پھر چاہے وہ اپنے اعمال اور اخلاق میں خفیہ اور علانیہ قانون الٰہی کی کتنی ہی خلاف ورزیاں کرتا ہے، مگر "دینداری" بہرحال اس کے ساتھ چپکی رہے گی۔ اس کا شمار متشرع لوگوں ہی میں ہوگا۔ اور وہ اپنی ظاہری ہیئت سے عام مسلمانوں کو اور شاید خود اپنے نفس کو بھی عمر بھر دھوکا دیتا رہیگا۔ برعکس اس کے اگر کوئی شخص اس مقررہ پیمانہ سے ایک انچ کا سولھواں حصہ بھی کم نکلے تو بلا تامل اس کو فاسق، فاجر، بددین قرار دے دیا جائے گا۔ پھر اس کی نماز، اس کا روزہ، اس کی پرہیزگاری، اس کی اخلاقی طہارت، سب ان کے نزدیک بے معنی ہیں، حتیٰ کہ اگر وہ فاسق کسی اجر و معاوضہ کے بغیر اللہ کے دین کی خدمت کرے اور راہِ خدا میں اپنے نفس اور مال کی قربانی دے تب بھی مذہب کے یہ اجارہ دار اس کی تمام خدمات پر پانی پھیر دیں گے، محض اس لئے کہ چند جزئیات میں اس کا عمل ناقص ہے، اور ان کے مذہب میں اصل دین بس یہی

جزئیات ہیں ــــــ اگر ابو محجن ثقفی ان حضرات کے دور میں ہوتے تو یقیناً یہ شراب خوری کے جرم میں ان کی پیٹھ کے ٹکڑے ہی اڑا دیتے، اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو جنہوں نے میدانِ جہاد میں ابو محجن کی جانفشانی دیکھ کر حد شرعی معاف کر دی تھی، نہ معلوم کیسے تند و تیز الفاظ میں مطعون کرتے!

اصل یہ ہے کہ انہوں نے حقایق اور معانی کو بالکل فراموش کر دیا ہے اور صرف اعمال کی ظاہری صورتوں ہی کو یہ دین سمجھتے ہیں۔ اس غلط تصوّر کا نتیجہ یہ ہے کہ احبار یہود نے جس طرح ظاہر پرستی میں شریعت الٰہی کی روح اور اس کے مقاصد کو گم کر دیا تھا، اسی طرح یہ حضرات بھی اس کو گم کر بیٹھے ہیں ظاہری شکلوں کے الٹ پھیر سے حرام کو حلال اور ناجائز کو جائز کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے نزدیک بھی ان تغیرات سے حقیقت بدل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے عقیدہ میں زکوٰۃ کے لئے تملیک شرط ہے اور مدرسے کے فنڈ میں زکوٰۃ داخل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کے پاس زکوٰۃ لائے تو یہ اس کو چھوڑیں گے نہیں بلکہ ایک غریب طالب علم کو بلائیں گے اور اس سے کہیں گے کہ تو ایک ہاتھ سے زکوٰۃ لے لے اور دوسرے ہاتھ سے مدرسے کو ہبہ کر دے۔ اس طرح جو چیز ناجائز ہے وہ محض ہاتھ بدلنے سے جائز ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ بھی بالکل جائز ہے کہ ایک شخص کو روپیہ دے کر اس بات پر تیار کیا جائے۔

کہ وہ مطلقہ عورت سے نکاح کرکے اسے طلاق دیدے اور اس تدبیر سے وہ شوہر اول کے لئے حلال ہو جائے۔ جو لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دے کر پشیمان ہوتے ہیں اور انہیں دوبارہ اپنے نکاح میں لانا چاہتے ہیں انہیں حلالہ کرنے کی یہ تدبیر علانیہ ہمارے دارالافتاؤں میں سکھائی جاتی ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ اس سے قرآن کا اصل مقصد ہی فوت ہؤا جاتا ہے۔ وہاں تو تحلیل کی شرط لگائی ہی اس لئے گئی تھی کہ اس کڑی شرط کی وجہ سے لوگ طلاق دیتے ہوئے ڈریں مگر اس حیلہ نے مالدار اور با اثر لوگوں کے لئے اس چیز کو آسان بنا دیا جسے اللہ مشکل بنانا چاہتا تھا۔ ختم سال سے پہلے روپے کو بیوی کے نام ہبہ کرنا اور پھر ختم سال سے پہلے اپنے نام ہبہ کرا لینا اور اس طرح فریضہ زکوٰۃ سے بچ جانا، یہ بھی ایک معروف حیلہ ہے جس کو اچھے خاصے متشرع حضرات خود استعمال فرماتے ہیں اور دوسروں کو سکھاتے ہیں۔ ان حرکات پر دراصل حضرت ایوب کے تخنث کی نہیں بلکہ اصحاب السبت کی مثال راست آتی ہے جن کی دینداری کو آزمانے کے لئے اللہ نے ہفتہ کے روز مچھلیاں پکڑنا حرام کیا تھا تو انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ جمعہ کے روز جال پھینک کر چھوڑ دیتے، اور اتوار کے روز جاکر مچھلیاں پکڑ لیتے، تاکہ ان کی خواہش نفس بھی پوری ہو جائے، اور فرمانبرداری کی ظاہری شکل بھی نہ بگڑے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان تدبیروں سے اللہ تعالیٰ بھی دھوکا کھا جائے گا۔ مگر اللہ

نے اس بدترین فسق کو طاعت اور تقویٰ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ○

جاہلیت ہی کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ کتاب اللہ اور سنت اللہ کو چھوڑ کر اپنے رجحانِ نفس اور میلانِ طبع کو دین و شرع کا پیمانہ بنا لیا گیا ہے۔ مآخذ علم میں شارع نے یہ ترتیب رکھی تھی کہ پہلے کتاب اللہ پھر سنت رسول اللہ پھر راسخین فی العلم کے اجتہادات۔ لیکن یہاں اس ترتیب کو الٹ کر یوں کر دیا گیا کہ پہلے ان ائمہ کے اجتہادات جن سے ہم کو عقیدت ہے۔ پھر سنت رسول اللہ جس کا علم صرف اس لئے حاصل کیا جاتا ہے کہ اپنے پسندیدہ مذہب کی تائید میں دلائل فراہم ہوں۔ سب سے آخر میں کتاب اللہ جس کو پڑھنے کا مقصد علم دین کی تحقیق نہیں بلکہ محض حصول ثواب ہے یا پھر کلام الٰہی کی بلاغت اور اس کے محاسن لفظی سے لطف اندوز ہونا۔ اسی طرح عقائد میں شارع نے یہ ترتیب رکھی تھی کہ سب سے اول ایمانیات، پھر وہ اعتقادی جزئیات جن میں تعبیر و تاویل کے اختلاف کو خود صاحب شریعت علیہ السلام اور صحابہ اور ائمہ نے جائز رکھا ہے۔ مگر اس ترتیب کو الٹ کر ہر گروہ نے اپنے اہواء کے مطابق یوں کر دیا کہ سب سے پہلے وہ جزئی عقیدہ جس سے ایک فرقہ کو خاص دلچسپی ہے۔ پھر ایمانیات جن پر اعتقاد رکھنے کے باوجود ایک

شخص صرف اس لئے کافر، ملحد، زندیق، فاسق اور گمراہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس خاص جزئی عقیدہ میں ان سے متفق نہیں۔ اسی طرح اوامر میں شارع نے یہ ترتیب رکھی تھی کہ سب سے اوّل فرائض پھر سنن موکدہ پھر مستحبات علیٰ اختلاف مدارجہا۔ اس ترتیب کو بھی ہر گروہ نے اپنی دلچسپیوں کے لحاظ سے الٹ کر رکھ دیا۔ اب وہ اوامر جو استحسان و استحباب کے درجہ میں ہیں سب سے بڑھ کر اہمیت رکھتے ہیں، ان کے بعد موکدات کا درجہ آتا ہے اور آخر میں فرائض ہیں۔ یہی صورت معاملہ منہیات کے باب میں بھی پیش آئی ہے۔ شارع نے سب سے بڑھ کر محرمات اور کبائر کی ممانعت پر زور دیا ہے اس کے بعد صغائر کا مرتبہ آتا ہے اور آخر میں وہ منکرات و مکروہات ہیں جن کی ممانعت تبصریح نہیں کی گئی ہے بلکہ تخریج و استنباط کے طور پر اشارۃ النص یا دلالۃ النص سے نکالی گئی ہے۔ مگر ہر جماعت نے اپنے رجحانِ طبع کے زیر اثر اس ترتیب کو بھی الٹ دیا۔ اب تیسرے درجہ کے مکروہات پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے اس کے بعد صغائر کا مرتبہ آتا ہے اور آخر میں محرمات اور کبائر ہیں جن کا ذکر زبانوں پر کم ہی آتا ہے — یہ سب سے بڑی اور سب سے بدتر بدعت ہے، جس کو ام البدعات کہنا چاہئے۔ اور یہ تمام بدعات سے بڑھ کر

خطرناک ہے، کیونکہ اس کو علم دین اور تشریع اور للّٰہیت کا لباس پہنا دیا گیا ہے، حالانکہ اس کی بنا دراصل اس نہایت گہری ہوا پرستی پر قائم ہے جو نفس کے چور خانوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اس فتنۂ عظیم کی شاخیں بے شمار، اور اس کے نتائج بے حد و حساب ہیں۔ علم دین میں جمود قابلیت اجتہاد کا فقدان، فرقہ بندی میں غلو، تکفیر و تفسیق کی گرم بازاری، مہمات سے بے پروائی اور لاطائل فضولیات میں انہماک کرنے کے کاموں کو چھوڑ دینا اور لایعنی باتوں میں اپنی ساری قوتوں کو ضائع کر دینا، یہ سب اسی ایک فتنہ کے نتائج ہیں۔ حاملانِ دینِ متین مطمئن ہیں کہ اِنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا، اور شیطان تعلیں بجا رہا ہے کہ جو قوم قرآن جیسی خطرناک کتاب رکھتی تھی، جس سے خوف تھا کہ جاہلیت کا تختہ الٹ کر رکھ دے گی، اس کو وہ اس ذوق فضول میں لگا دینے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک طرف سے جاہلیت اولیٰ مسلمانوں کی ذہنیتوں پر یوں بار بار حملے کر کے انہیں اسلامی تصورات سے بیگانہ بنا گئی، اور دوسری طرف سے جاہلیتِ فرنگ نے اپنے جدید ہتھیاروں سے قرآنی تہذیب کی رہی سہی یادگاروں پر بھی یلغار کر دی۔ قدیم جاہلیت کی فتحمندیوں نے اندر سے دین کے نظام کو مسخ کیا اور جدید جاہلیت نے اجتماعی

خیالات اور سیاسی، معاشرتی، اور معاشی نظریات کو الٹ کر رکھ دیا حتیٰ کہ آج ہم بحسرت دیکھ رہے ہیں کہ اللہ کی اس پھیلی ہوئی زمین پر ایک گوشہ بھی ایسا موجود نہیں جہاں اسلامی نظام زندگی اپنی کامل صورت اور بے آمیز ہیئت اجتماعی کے ساتھ نافذ ہو۔ اگر کہیں اس نظام کا کوئی دھندلا سا خاکہ ہے بھی تو تہذیب حاضر کے موجودہ سیلاب کے سامنے اس کی حیثیت بالکل وہی ہے جو کسی پُرشور سمندر کی طوفانی لہروں میں ایک کشتی کے ٹوٹے ہوئے تختوں کی ہوتی ہے اور یہ نتیجہ ہے اپنی اس وقت کی خود فراموشی کا جب ہم نے یورپ کو ایک ہاتھ سے قلم اور دوسرے سے تلوار بخشتے ہوئے کہا تھا کہ لو

یہ تیغ ہے یہ طشت ہے یہ ہم ہیں کشتنی

لہٰذا اب سعادت تو اسی میں ہے کہ مادی تہذیب کا نشتر جب اسلامی نظام کی ایک رگ کاٹ لے تو دوسری اس کے سامنے کر دی جائے اور الحمد للہ کہ ہم اس فریضۂ سعادت کو بڑی تندہی اور خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں مغرب سے آواز آئی کہ ۱۳۵۰ برس کا پُرانا مذہب خواہ کیسا ہی کامل اور وسیع کیوں نہ ہو، موجودہ دور تمدن میں کام نہیں دے سکتا۔ ہم نے کہا اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا۔ ایک مادہ پرستانہ نظام غربا پروری کا جامہ پہن کر روس سے چلا تو ہم نے یہ کہتے ہوئے بڑھ کر اس کا

خیر مقدم کیا کہ اسلامی مواساۃ تو اسی اشتراکیت کا نام ہے۔ مغرب نے اپنا معاشی نظام بلینکنگ اور انشورنس پر قائم کیا تو ہمارا مفتی بول اٹھا کہ کہ ہندوستان دار الحرب ہے، یہاں سود لینا (جس کی شان میں فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ کی تہدید نازل ہوئی تھی) جائز ہے مستحسن ہے، بلکہ سراپا رحمت ہے، وَمَنْ یُّقْرِضَ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا الآیہ کا شان نزول یہی سودی کاروبار ہی تو ہے۔ تمدن اور معاشرت نے نئے نئے فیشن ایجاد کئے تو ہمارے "تعلیم یافتہ" حضرات نے اسلامی وضع قطع پر دقیانوسیت کے فتوے لگائے اور اسے دیکھ کر وَاِذَا مَرُّوْا بِھِمْ یَتَغَامَزُوْنَ کی یاد تازہ کی۔ اباحتِ نفس کے اشارے پر مغرب نے پردہ کو خلافِ انسانیت ٹھیرایا تو ہم نے بھی سُر میں سُر ملا کر کہا کہ یہ پردہ تو نسوانیت کی تحقیر بلکہ اسلامی نظریۂ مساوات کی صریح خلاف ورزی ہے۔ وطنیت اور قومیت کے نظریے پیدا ہوئے تو ہم نے حب الوطن من الایمان سے اس کی تصدیق شروع کردی مصر میں اسی تخیل نے ہم سے فراعنہ پرستی کرائی، اسی کے عشق میں ایران وترکی نے اسلامی نظریۂ قومیت کے ایک ایک نشان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مٹایا اور وہاں کی دو ہزار برس پہلے کی مٹی ہوئی تہذیب کو زندہ کرنے میں اپنی سربلندی دیکھی۔ اسلامی قوانین حکومت کو چھوڑ کر مغرب کے بنائے

ہوئے آئین وقانون اختیار کئے۔ حتیٰ کہ ترکی نے مغربی تصور کے اتباع میں اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ وہاں کی حکومت نام کو بھی اسلامی خلافت رہ جائے۔ اور جب اس پر بھی صبر نہ ہو سکا تو اسلامی تصور کا رہا سہا داغ بھی اس نے اپنے دامن سے مٹا دیا، اور اس دفعہ کو، جس کے ذریعہ حکومت کا مذہب اسلام قرار پایا تھا، اڑا کر یہ دفعہ مرتب کی گئی کہ آئندہ سے ترکی حکومت اسلامی حکومت کے بجائے قومی اور جمہوری حکومت کہلائیگی۔

اسلامی تصورات سے یہ بعد اور تنفر کچھ ایک سلطنت یا ملک تک محدود نہیں ہے۔ ممالک اسلامیہ میں سے جو بھی ترقی کا ولولہ لے کر اٹھتا ہے کعبۂ فرنگ کی طرف منہ کر لیتا ہے، خواہ غلام ہو یا نام کا آزاد۔ آج قریب قریب تمام مسلمانوں نے اپنے دل ودماغ مغرب کے حوالہ کر دئیے ہیں۔ مغربی نقطہ نظر ہمارے نظام زندگی کے ایک ایک جزو میں سرایت کر گیا ہے۔ ہماری اجتماعی ذہنیت پر جاہلیت جدیدہ کا ایسا گہرا رنگ چڑھ گیا ہے کہ اسلامی نظریات کا کوئی نقش اس پر اترتا ہی نہیں صبغۃ اللہ جس امت کا قومی نشان تھا وہ یورپین اصطباغ لینے کے لئے والہانہ دوڑی چلی جا رہی ہے۔ اس کے نزدیک اب صداقت کا معیار اور نجات وسربلندی کا ذریعہ مغربی قول وفعل ہے گویا جس طرح قرآن مہیمن تھا پچھلی کتابوں کی ناقص اور محرف تعلیمات

کا، اب ہمارے مغرب سے نازل ہونے والی وحی مہیمن ہے (العیاذ باللہ) قرآنی نظریات و تصورات کی۔ جاہلیت کی جو سب سے بڑی تمنا ہو سکتی ہے وہ یہی ہے جسے پورا کرنے کے لئے ہم جی رہے ہیں۔ امت مرحومہ کے اخلاف و اسلاف میں اگر کوئی نسبت ہے تو یہی کہ ایک "طُوبیٰ لِلْغُرَبَاءِ" کی پیشین گوئی کا مظہر ہے، دوسرا "وَسَیَعُودُ غَرِیبًا" کی پیشین گوئی کا۔

لیکن ہاں مایوسی اور نامرادی کی اس ہمہ گیر تاریکی میں ابھی امید کی ایک کرن باقی ہے۔ باطل کی فطرت ثبات ناآشنا ہے۔ وہ پھیلنا جانتا ہے مگر ثابت قدم رہنا نہیں جانتا۔ متمدن انسان جاہلیت کے سیلاب میں بہ تو گیا مگر اس کے تھپیڑے کھا کھا کر موجودہ نظام تہذیب سے وہ پریشان بھی ہو رہا ہے۔ جہل پرستی کے تلخ نتائج ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ رہے ہیں اور وہ امن و سلامتی کی جستجو میں بیگانہ وار سرگرداں ہے۔ مگر چونکہ اس کے سامنے عملی دنیا میں کہیں بھی شے اپنی اصلی صورت اور بے نقاب ہیئت میں موجود نہیں اس لئے جب کوشش کر کے جاہلیت کے ایک پھندے سے وہ اپنی گردن چھڑاتا ہے تو دوسرا پھندا اسے اپنے حلقہ میں لے لیتا ہے۔ امپیریلزم اور سرمایہ داری کی ظالمانہ سخت گیریوں سے گھبرایا تو اشتراکیت کی لعنت میں جا پھنسا۔

جمہوریت سے تنگ آیا تو ڈکٹیٹر شپ کی خندق میں جاگرا۔ نکاح وطلاق وغیرہ معاشرتی قوانین میں (جن کے بارے میں کل تک وہ اسلام پر خندہ زن تھا) اپنی غیر فطری اور خیالی بندشوں کو توڑکر اباحیت مطلقہ (licentiousness) نسوانیت: (feminism) اور برتھ کنٹرول کے مہالک میں گرفتار ہو گیا۔ غرضیکہ ایک عام بیقراری اور اضطراب کے دور سے دنیا گذر رہی ہے۔ جاہلیت کے دباؤ سے اس کی رُوح بے تاب ہو رہی ہے۔ گویا زمین تیار ہو چکی ہے، بیج ڈالنے کی ضرورت ہے۔ سراب جاہلیت میں بھٹکتی ہوئی دنیا پیاس سے بیقرار ہے، کاش سینۂ عرب سے اُبلے ہوئے سرچشمۂ حیواں کو خس و خاشاک سے پاک کر کے اس کے سامنے کر دیا جائے، یعنی وہ اسلام جس سے ساری دنیا بے گانہ ہے اور جو ساری دنیا سے اجنبی، جاہلی افکار و تصورات کے غبار میں چھپا پڑا ہے، پھر اسے ازسرنو دنیا سے مانوس اور اس کے الٰہی نظام کی برکتوں کو نمایاں کر کے دنیا سے روشناس کرایا جائے۔ آج ضرورت ہے اسلام کو ایسے ہی مردانِ کار اور اصحاب عزیمت کی جو مشرق و مغرب کی ذہنیتوں کے خلاف صف بستہ ہو سکتے ہوں اور تلاش ہے اسلام کو ایسے ہی "غربا" کی جو ہوا پرستی اور جاہلیت کے اس طوفان میں قدم جما کر کھڑے ہو جائیں۔ اسلامی نظریات و تصورات

کو اپنی زندگی کا رہنما بنائیں۔ قرآن کی رُوح میں جذب ہو جائیں۔ اور اسلامی نظامِ حیات کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر نافذ کر کے اسلام کے چہرہ سے غرابت کا پردہ اٹھا دیں۔ یہی تجدیدِ ملت ہے۔ یہی احیائے دین ہے۔ یہی اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ یہی نصرتِ اسلام اور یہی وراثتِ رسول ہے۔ قدرت "طُوبیٰ لِلغُرَبَاء" کی بشارت دینے کے لئے منتظر کھڑی پکار رہی ہے۔ اگر مسلمانوں کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت کی جستجو ہے تو انہیں اس پکار کا جواب دینا پڑے گا۔

اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم وَلَا تَجْعَلْنَا مِنْھُمْ

اَللّٰھُمَّ قَھِّرْ اَعْدَائَنَا وَشَتِّتْ شَمْلَھُمْ وَفَرِّقْ جَمْعَھُمْ وَقَلِّبْ تَدْبِیْرَھُمْ وَخَرِّبْ بُنْیَانَھُمْ وَبَدِّلْ اَحْوَالَھُمْ وَقَرِّبْ اٰجَالَھُمْ وَقَصِّرْ اَعْمَارَھُمْ وَشَغِّلْ بِاَبْدَانِھِمْ وَخُذْھُمْ اَخْذَ عَزِیْزٍ مُّقْتَدِرٍ ۝

اسی مصنف کی دوسری تصنیفات

۱۔ حقیقت نفاق : اس کتاب میں منافق اور منافقت کے خصائص و نشانات کو واضح کرکے مومن بننے اور خالص ایمان کو پہچاننے کی طرف رہنمائی کی ہے۔ بڑی مقبول اور پسندیدہ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

۲۔ افادات۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی :۔
اس کتاب میں شاہ صاحب کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے بعض ابواب کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ جو اہم دینی و سیاسی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

۳۔ اسلام اور وطنیّت :۔ کتاب کے نام ہی سے اس کا موضوع بحث ظاہر ہے۔ مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی کے مخصوص خیالات اور زبان کا رنگ ڈھنگ اس کتاب میں اصلاحی صاحب نے خوب نباہا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

اس کے علاوہ افاداتِ حافظ ابن قیّم بھی زیرِ تالیف ہے۔

مینیجر مکتبہ پاکستان ۵۴ (الف) سرکلر روڈ۔ بیرون موچی دروازہ لاہور

ہماری مطبوعات

۱۔ دربار رسول کے فیصلے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں مقدمات دیوانی و فوجداری کے فیصلہ جات صادر فرمائے تھے کتاب ان کا ایک مجموعہ ہے اور عربی سے اردو زبان میں ترجمہ کی گئی ہے۔ قیمت مجلد للعہ

۲۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان: سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام اور کفر کے خلاف جو جہاد کیا تھا۔ اسکی داستان ایک انگریز آئی سی ایس مصنف کے زبان قلم سے سنئے۔ کتاب کی خوبی اور اسکی اہمیت کا اندازہ کچھ اس کے مطالعہ کے بعد ہی ہوگا۔ قیمت ۱۲عہ ؍

۳۔ اقبال پر ایک نظر: ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شاعری پر مولانا ظفر علی خاں کا تبصرہ، مولانا سالک کے قلم سے اقبال اور ٹیگور کی شاعری کا مقابلہ جناب عبدالسلام خاں رضوی کی الٰہیات کا ایک مجمل خاکہ اور جناب سراج الدین محمود کا السحر الحلال فی کلام علامۃ الاقبال مطالعہ کرنا چاہیں تو اقبال پر ایک نظر کو پڑھیں مندرجہ بالا مضامین کے علاوہ اور بہت سے مفید مضامین اس کتاب میں درج ہیں خوبصورت جلد اور دیدہ زیب گردپوش نے کتاب کے ظاہری محاسن کو بھی چار چاند لگائے ہیں۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔

۴۔ شرح اسرار خودی: علامہ اقبال کی بنیادی تصنیف "اسرار و رموز" کی تشریح و توضیح آپ چاہیں تو شرح اسرار خودی مصنفہ پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

منیجر اقبال اکیڈیمی 54 A سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور